آل پاکستان رائٹر ویلفئیر ایسوسی ایشن (اپووا)

اپووا ڈائجسٹ

(آن لائن)

شمارہ اکتوبر 2026

علم، ادب، فن اور مثبت فکر کا حسین منظر

سرپرست

ملک یعقوب اعوان
سینئیر وائس چیئرمین اپووا

زیرِ نگرانی

ایم ایم علی
بانی و صدر اپووا

نگران اعلی
ایم ایم علی
(بانی و صدر اپووا)

زیر سرپرستی
ملک یعقوب اعوان
(سینیئر وائس چیئرمین

مدیر اعلیٰ:
سلمی کشم

مدیرہ:
فائزہ شہزاد

سب مدیرہ:
سمیرا شفق

میگزین ڈیزائنر:
ملائکہ حورین

اداریہ

عزیز قارئین! السلام علیکم!
اپوا ڈائجسٹ اکتوبر کا نیا شمارہ ایک بار پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ ہر شمارہ ہمارے لیے محض چند صفحات کا مجموعہ نہیں بلکہ آپ کی محبت، اعتماد اور ادبی ذوق کی ایک خوب صورت جھلک ہوتا ہے۔ آپ کی حوصلہ افزائی ہی وہ جذبہ ہے جو ہمیں ہر بار کچھ نیا، بہتر اور بامقصد پیش کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔
اس بار کے شمارے میں بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ ادب کی مختلف اصناف کو ایک خوب صورت ترتیب کے ساتھ آپ تک پہنچایا جائے۔ کہانیاں، افسانے، کالم، مضامین اور شعر و شاعری ہر صنف اپنی الگ خوشبو اور اپنا الگ رنگ لیے ہوئے ہے۔ کہیں زندگی کے تلخ و شیریں تجربات ہیں کہیں معاشرے کے بدلتے ہوئے رویّوں کی عکاسی ہے کہیں رشتوں کی نزاکتوں کو لفظوں میں سمیٹا گیا ہے اور کہیں احساسات نے شعری پیکر اختیار کیا ہے۔
کہانی صرف واقعات کا بیان نہیں ہوتی، بلکہ اپنے اندر کسی نہ کسی زندگی، احساس یا حقیقت کو چھپائے رکھتی ہے۔ اس شمارے کی کہانیاں بھی قاری کو مختلف کیفیتوں سے گزارتے ہوئے کہیں مسکرانے، کہیں ٹھہر کر سوچنے اور کہیں اپنے اردگرد کے لوگوں اور حالات کو نئے زاویے سے دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ افسانوں میں انسانی زندگی کے مختلف رنگ نمایاں ہیں۔ مختصر پیرائے میں بڑے موضوعات کو بیان کرنا ایک مشکل فن ہے، مگر ہمارے لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں کرداروں، جذبات اور معاشرتی حقیقتوں کو پیش کرنے کی خوب صورت کوشش کی ہے۔
امید ہے کہ یہ افسانے آپ کے دل پر بھی وہی اثر چھوڑیں گے جو ایک اچھی تحریر کا مقصد ہوتا ہے۔ کالم کسی بھی ادبی جریدے کا ایسا حصہ ہیں جہاں قلم کار اپنے مشاہدے، تجربے اور فکر کو براہِ راست قارئین تک پہنچاتا ہے۔ اس شمارے کے کالموں میں بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال ملے گا۔ بعض تحریریں ہمیں اپنے اردگرد کے حالات پر غور کرنے کا موقع دیتی ہیں تو بعض روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات میں چھپی بڑی حقیقتوں کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور پھر شعر و شاعری جو دل کی ان کیفیات کو زبان عطا کرتی ہے جنھیں نثر میں بیان کرنا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس شمارے میں شامل اشعار اور شعری تخلیقات محبت، جدائی، امید، زندگی، احساس اور انسانی جذبات کے مختلف رنگ لیے ہوئے ہیں۔ یقین ہے کہ شعری صفحات بھی آپ کو اپنی طرف متوجہ کریں گے اور کچھ اشعار دیر تک آپ کے ساتھ رہیں گے۔
ہماری ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ اپوا ڈائجسٹ محض ایک رسالہ نہ ہو بلکہ لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے درمیان ایک خوب صورت ادبی رابطہ بنے۔ نئے قلم کاروں کو اظہار کا موقع ملے، تجربہ کار اہلِ قلم کی تحریریں قارئین تک پہنچیں اور ادب سے محبت رکھنے والے سب لوگ اس ادبی سفر کا حصہ بن سکیں۔ ہم اپنے تمام لکھاریوں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنی قیمتی تخلیقات ہمیں بھیجیں اور اس شمارے کو اپنے قلم کے رنگوں سے سجایا۔ ان کی محنت، محبت اور اعتماد ہی

اس سفر کا اصل سرمایہ ہے۔
آپ سے بھی یہی درخواست ہے کہ اپوا ڈائجسٹ کو صرف پڑھیں نہیں، اپنی رائے سے بھی نوازیں۔ تنقید ہو، مشورہ ہو یا حوصلہ افزائی آپ کی ہر رائے ہمارے لیے اہم ہے، کیونکہ ایک بہتر ادبی سفر ہمیشہ لکھنے والے اور پڑھنے والے کے باہمی تعلق سے ہی آگے بڑھتا ہے۔
ہم امید کرتے ہیں کہ اس شمارے کے صفحات آپ کے لیے خوش گوار مطالعے کا باعث بنیں گے، کچھ لمحے آپ کو اپنی مصروف زندگی سے نکال کر لفظوں کی دنیا میں لے جائیں گے اور کچھ تحریریں آپ کے دل و دماغ میں دیر تک اپنی جگہ بنائے رکھیں گی۔
اپنی دعاؤں، محبت اور قیمتی آرا کے ساتھ ہمارا ساتھ دیتے رہیے۔

والسلام

مدیرہ اعلیٰ (اپوا ڈائجسٹ)
سلمیٰ کشم

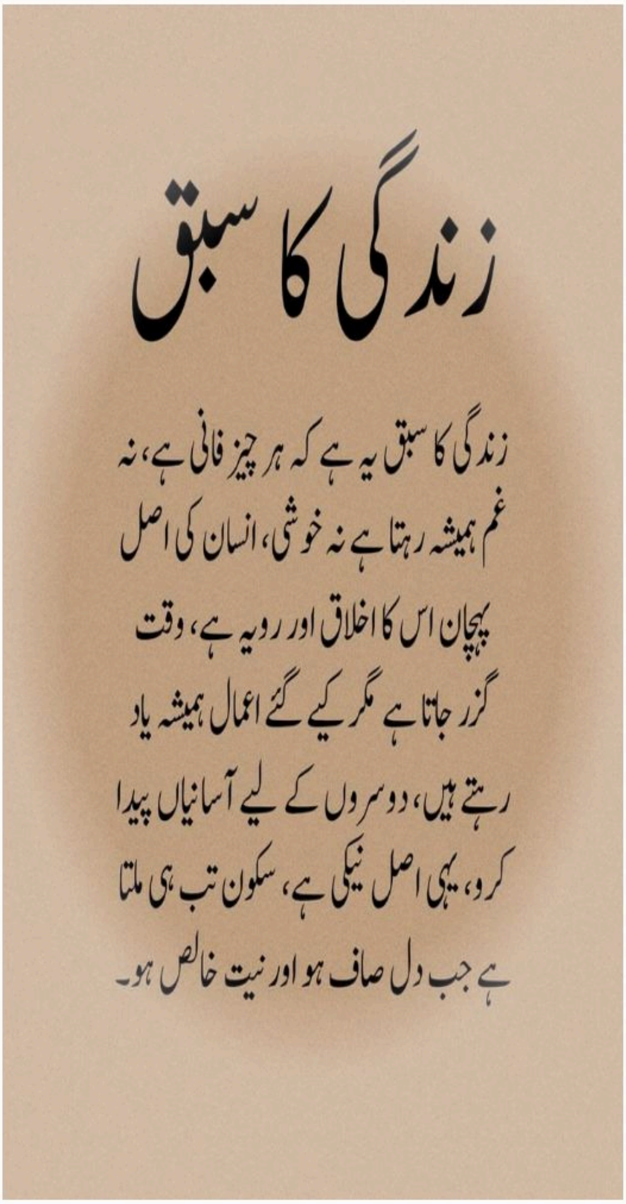

فہرست

نعت (سلمیٰ کشم) 6
تعلیم نسواں (عنبر فاطمہ) 7
چراغ کردار (لبنیٰ نوید) 8
بلاعنوان (فائزہ شہزاد) 10
غصہ؛ چند سیکنڈ کا طوفان، برسوں کا پچھتاوا (فاطمہ افضال) 13
جھوٹ کا سرطان (سمیرا شفق) 14
بیوہ ماں کی ڈاکٹر بیٹی (رامین محمد شاہد) 16
چالان (آسیہ بی بی) 19
فائزہ شہزاد کے ساتھ ایک نشست 20
ہم اور ہماری سکن (نیلوفر سمیع، کاسمیٹولوجسٹ) 29
غزل (شہزاد نیر) 30
غزل (شہزین فراز) 31
غزل (فیضان احمد فیضی) 31
نثری نظم (ملک یعقوب اعوان) 32
نظم (ملائکہ حورین) 32

نعت رسول مقبول ﷺ

(سلمی کشم)

سرشار ہوں کہ میں بھی ہوں امت حضور ﷺ کی
ہر شے سے بڑھ کے مجھ کو ہے چاہت حضور ﷺ کی

عشقِ رسول ﷺ میں جو تڑپتا ہے میرا دل
مشکل بہت ہے جھیلنا فرقت حضور ﷺ کی

دل میں بسی ہوئی ہے مرے سیرت النبی ﷺ
دونوں جہاں پہ چھائی ہے رفعت حضور ﷺ کی

کیا اِنس و جِن زمین و فلک اور بحر و بر
"وجہِ وجودِ خلق ہے خلقت حضور ﷺ کی"

دل سے مرے نکلتی ہے بس ایک ہی دعا
جنت میں لے کے جائے شفاعت حضور ﷺ کی

تبلیغِ دینِ حق بھی کی میٹھی زبان سے
عمدہ ہے کتنی دیکھیے فطرت حضور ﷺ کی

ڈوبا ہے سلمی دل مرا عشقِ رسول ﷺ میں
ہے مومنوں کے دل پہ حکومت حضور ﷺ کی

"تعلیمِ نسواں"
(عنبر فاطمہ)
اخوت کالج چکوال

ہم نے بالآخر دنیا میں پانی کی قلت کی اصل وجہ دریافت کر ہی لی۔
دراصل کچھ عرصے سے دنیا میں موجود پانی کو مسلسل سیاہی میں تبدیل کیا جا رہا ہے، اور اسی سیاہی سے زیرِ بحث موضوع پر کتابوں کی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لوگوں نے وہ کتابیں پڑھیں، ان سے کتنا استفادہ کیا اور کتنا نہیں کیا، یہ بہرحال ہمارا مسئلہ نہیں۔
تعلیمِ نسواں پر لکھتے ہوئے نہ جانے کتنی پڑھی لکھی خواتین کی مثالیں دی گئیں، کتنے مفکرین کے اقوال نقل ہوئے، نسلوں کے سنورنے سے لے کر معاشروں کے بدلنے تک کے دلائل پیش کیے گئے۔ الغرض، زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ بچا ہو جہاں عورت کے تعلیم یافتہ ہونے کے فوائد نہ گنوائے گئے ہوں۔
ہم سے البتہ ایسی توقع مت رکھیے گا۔ ہم اس موضوع پر زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ بس آج کل ہر طرف لوگوں کو اسی موضوع پر قلم آزماتے دیکھا تو سوچا، کیوں نہ ہم بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔
قلم اٹھایا تو ایک واقعہ یاد آ گیا۔
ہمارا ایک آبائی گاؤں ہے جہاں خواتین کی تعلیم پر خاص توجہ نہیں دی گئی۔ چند ایک خواتین پرائمری یا مڈل تک پڑھی ہوئی تھیں، مگر ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔
انہی میں سے ایک خاتون نے سردیوں کی ایک دوپہر ٹیلی وژن پر خبر دیکھی:
"کل ملک بھر میں کہر پڑے گا۔"
خاتون اتنی ضرور پڑھی لکھی تھیں کہ خبر پڑھ سکیں، مگر "قہر اور کہر" کے فرق سے نابلد تھیں۔ بلکہ قوی امکان ہے کہ لفظ "کہر" سے ہی واقف نہ تھیں۔
سو انہوں نے جو سمجھا، وہ یہ تھا کہ کل خدا کا "قہر" نازل ہونے والا ہے۔ یا شاید قیامت ہی برپا ہونے والی ہے۔
جذبۂ ایمانی سے سرشار ہو کر فوراً گھر سے نکلیں اور گاؤں کے گھر گھر جا کر یہ خوش خبری نہیں بلکہ قیامت کی پیش خبری سنائی۔ کچھ ہی دیر میں گاؤں کی خواتین نے باہمی مشاورت سے فیصلہ کیا کہ رات بھر گاؤں کے ایک گھر میں اکٹھی ہو کر نوافل ادا کیے جائیں گے، توبہ کی جائے گی اور شاید اس طرح آنے والی آفت کو ٹالا جا سکے۔
مرد حضرات سے یہ معاملہ مکمل طور پر پوشیدہ رکھا گیا۔
شاید خواتین مردوں کو جنت میں داخلے کا یہ موقع دینا ہی نہیں چاہتی تھیں۔
رات بھر نوافل ادا ہوئے، دعائیں مانگی گئیں، توبہ استغفار ہوا، اور جب خواتین کو اپنی مغفرت کا خاصا اطمینان ہو گیا تو صبح کی پو پھوٹتے ہی سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئیں۔
راوی بیان کرتا ہے کہ ہم مرد حضرات کو تو حسبِ معمول ناشتہ پیش کر دیا گیا، مگر خواتین کی بھوک پیاس شاید قیامت کے خوف میں ہی کہیں مر چکی تھی۔ دوپہر تک ہر خاتون کا چہرہ اترا ہوا اور سانسیں خشک تھیں۔
مرد حضرات کافی دیر تک ان حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ بالآخر ایک نے پوچھ ہی لیا

کہ معاملہ کیا ہے۔
اب ہماری مودب خواتین کے لیے المیہ یہ تھا کہ مجازی خدا نے پوچھ لیا تھا، سو جواب دینا لازم ٹھہرا۔
یوں وہ راز جو رات بھر مردوں سے چھپایا گیا تھا، چند لمحوں میں گاؤں کے مرد حضرات تک پہنچ گیا۔
خوش قسمتی سے مرد حضرات قدرے خواندہ تھے اور "قہر اور کہر" میں فرق جانتے تھے۔
خاتون کی غلط فہمی دور کی گئی۔ قیامت بھی ملتوی ہو گئی، قہر بھی نہ آیا اور گاؤں کے لوگ حسبِ معمول اپنی زندگی کی طرف لوٹ گئے۔
مگر راوی کے واقعہ بیان کرتے ہوئے اور بیان کرنے کے بعد اگر ہمارے ذہن میں کوئی بات آئی تو وہ یہ تھی کہ تعلیمِ نسواں سے نسلیں سنوریں یا نہ سنوریں، معاشرے بدلیں یا نہ بدلیں، گھر کا چولہا سلیقے سے چلے یا نہ چلے، عورت معاشی طور پر خود مختار ہو یا نہ ہو، اسے کم از کم اتنا علم ضرور ہونا چاہیے کہ "قہر کب آتا ہے اور کہر کب پڑتا ہے۔"
کیونکہ بعض اوقات تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ نہیں ہوتا کہ انسان دنیا بدل دے؛
بس اتنا ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی ایک خبر غلط سمجھ کر پوری بستی کو قیامت کی تیاری میں نہ لگا دے۔

"چراغِ کردار"
(لبنیٰ نوید)

زندگی کے راستے پر چلتے ہوئے انسان بہت سی چیزیں بدلتا ہے۔ لباس، گھر، شہر، دوست، ترجیحات یہاں تک کہ کبھی کبھی اپنی رائے بھی۔ مگر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں وقت کے ساتھ بدل دینا دراصل خود کو کھو دینا ہوتا ہے۔ اصول بھی انہی چیزوں میں سے ہیں۔ میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے کہ انسان کی اصل آزمائش وہاں نہیں ہوتی جہاں اسے کچھ حاصل کرنا ہو بلکہ وہاں ہوتی ہے جہاں اسے کچھ حاصل کرنے کے لیے اپنے اصولوں میں سے کسی ایک کو قربان کرنا پڑے۔
میرے والد کہا کرتے تھے کہ کسی کے لیے آسانی پیدا کرو تو اس کے بدلے آسانی کی توقع مت رکھنا۔ اس وقت یہ بات بہت معمولی لگتی تھی مگر عمر کے ساتھ اس کی گہرائی سمجھ میں آئی۔ ہم اکثر نیکی بھی ایک خاموش حساب کے ساتھ کرتے ہیں۔ آج میں نے اس کا کام کر دیا کل وہ میرا کام کر دے گا۔ آج میں نے اس کا ساتھ دیا کل وہ میرے ساتھ کھڑی ہوگی۔ پھر جب ایسا نہیں ہوتا تو ہمیں اپنی نیکی سے زیادہ دوسرے کی بے وفائی دکھائی دیتی ہے۔ حالاں کہ سچی مدد وہی ہے جس کے بعد انسان پلٹ کر یہ نہ دیکھے کہ سامنے والے نے بدلے میں کیا دیا۔
سچ بولنے کا اصول بھی آسان نہیں تھا۔ زندگی میں ایسے مقام آئے جہاں ایک چھوٹا سا جھوٹ بڑے نقصان سے بچا سکتا تھا۔ ایک جملہ بدل دینے سے معاملہ میرے حق میں ہو سکتا تھا مگر

میں نے سچ کو چھوڑنے کی بجائے نقصان قبول کیا۔ کبھی دل نے ضرور کہا کہ آخر ایک جھوٹ سے کون سا آسمان ٹوٹ پڑے گا مگر پھر خیال آیا کہ اگر انسان اپنے فائدے کے لیے پہلی بار سچ کا سودا کر لے تو دوسری بار جھوٹ بولنا اسے اتنا مشکل نہیں لگے گا۔ عجیب بات ہے کئی مرتبہ سچ نے مجھے وقتی طور پر نقصان دیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نقصان دراصل کسی بڑے نقصان سے حفاظت تھا۔ شاید رب کی حفاظت ہمیشہ ہمیں نظر نہیں آتی۔ کبھی وہ کسی چھین لی گئی چیز کی صورت میں بھی ہوتی ہے۔

منافقت سے مجھے ہمیشہ خوف آیا۔ انسان کسی کے سامنے مسکرا کر اس کے پیچھے خنجر نہیں چلا سکتی اور پھر اپنے آپ کو اچھا انسان بھی سمجھتی رہے۔ یہ دو زندگیاں ساتھ لے کر چلنا مجھے کبھی نہیں آیا۔ اختلاف ہو تو سامنے کہو۔ محبت نہ ہو تو جھوٹی قربت کیوں۔ کسی کے عیب کا علم ہو تو اسے بازار میں لے جانے کے بجائے خاموش رہو۔ دوسروں کی کمزوریاں اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا شاید دنیا کی نظر میں ہوشیاری ہو مگر کردار کی نظر میں یہ ایک شکست ہے۔

لوگوں کو استعمال کرنے کا ہنر دنیا میں بہت مقبول ہے۔ کوئی کسی کی محبت استعمال کرتا ہے۔ کوئی کسی کی ضرورت۔ کوئی کسی کی دولت اور کوئی کسی کے تعلقات۔ ایسے لوگ بظاہر بہت آگے نکل جاتے ہیں مگر ان کے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر اکثر راستہ خالی ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو انہوں نے سیڑھی بنایا ہوتا ہے وہ منزل تک پہنچتے پہنچتے ان سے دور ہو چکے ہوتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہی چاہا کہ اگر کسی کا ہاتھ تھاموں تو اسے سہارا دوں۔ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اس کے کندھے کو سیڑھی نہ بناؤں۔

اور ہر بات پر لڑ پڑنا بھی مجھے کبھی بہادری نہیں لگا۔ انسان کو یہ فرق معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں خاموش رہنا ظرف ہے اور کہاں خاموش رہنا بزدلی۔ اپنی انا کے لیے لڑی گئی جنگیں اکثر جیت کر بھی انسان کو ہرا دیتی ہیں۔ لیکن جب معاملہ کسی بے قصور کی عزت کسی کمزور کے حق یا کسی ناانصافی کا ہو تو وہاں صرف اس لیے پیچھے ہٹ جانا کہ مصیبت اپنے سر نہ آئے میرے نزدیک بہادری نہیں۔ غیرت شور کا نام نہیں۔ غیرت وہ حوصلہ ہے جو انسان کو صحیح وقت پر صحیح طرف کھڑا کر دے۔

زندگی نے آخرکار مجھے یہ سمجھا دیا کہ اصول دوسروں کو سنانے کے لیے نہیں ہوتے۔ اصل اصول وہ ہیں جن پر انسان اس وقت بھی قائم رہے جب اسے معلوم ہو کہ اس کے حق میں کوئی گواہی دینے والا نہیں کوئی تعریف کرنے والا نہیں اور شاید کوئی اس کے فیصلے کو سمجھنے والا بھی نہیں۔ آسان راستہ ہر شخص کو مل جاتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ انسان مشکل راستے پر بھی اپنا کردار سلامت رکھے۔

اب جب میں پیچھے مڑ کر اپنی زندگی دیکھتی ہوں تو مجھے اپنی حاصل کی ہوئی چیزوں سے زیادہ وہ چیزیں عزیز لگتی ہیں جنہیں میں نے حاصل کرنے سے انکار کیا تھا۔ کسی کا حق مار کر کامیابی نہیں لی۔ جھوٹ کے سہارے منزل نہیں بنائی۔ کسی انسان کو اپنے مطلب کے لیے استعمال نہیں کیا۔ ظالم کے ساتھ صرف اس لیے نہیں کھڑی ہوئی کہ وہ طاقتور تھا۔ کسی کی مدد کا بدلہ

اس سے نہیں مانگا۔ شاید یہی زندگی کی اصل کمائی ہے۔ دولت عہدے اور شہرت انسان کے بعد رہ جاتے ہیں مگر کردار اس کے ساتھ چلتا ہے۔ اور جب دنیا کی ساری آوازیں خاموش ہو جاتی ہیں تو انسان کے اندر ایک ہی آواز باقی رہ جاتی ہے۔ تم نے اپنی زندگی کس اصول پر گزاری؟

"بلاعنوان"

(فائزہ شہزاد)

بچپن سے پچپن(۵۵) تک زندگی نے(اوہو! یہ غلط کہہ گئی، میں تو ابھی صرف سولہ سال کی ہُوں، آخر مسلمان کی ایک زبان ہوتی ہے) ہر روز ایک نیا سبق ہی پڑھایا ہے، بلکہ سکھایا ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ اِنسان "گود" سے "گور" تک سیکھتا ہی رہتا ہے۔ بقول شاعر:

ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

ہم انسان بھی عجیب ہیں، جب تک کسی کی آنکھ کھلی ہے تو اُس سے بڑا کوئی شیطان ہی نہیں اِس دنیا میں اور جیسے ہی اُس کی آنکھ بند ہوئی اُس سے بڑا کوئی فرشتہ ہی نہیں اور ایسی ایسی خوبی اس میں ڈال دی جاتی ہے جیسے سبزیوں کا مکس اچار (جس میں گوشت تک ڈال دیا جاتا ہے) ہو اور جس کا نام لینے سے پہلے وضو بھی ضروری ہو۔

بیچاری جمو خالہ جب تک زندہ تھیں، اُن میں ایسی ایسی خامیاں اور بُرائیاں تھیں کہ وہ خود پریشان ہو جاتی تھیں اور مجھے یہی کہتی رہتی: " ارے فیروزہ! میری بچی! مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب سچ ہی کہتے ہیں - مجھے کبھی معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں ایسی ہُوں، مجھے شاہین باجی نے بتایا ہے کہ تمہاری بڑی باجی کہہ رہی تھیں کہ جمو بچپن سے ہی ڈرامے باز تھی، ابا نے ٹی وی اسٹیشن جانے نہیں دیا تھا تو خاندان میں ہی اداکاری اور ڈرامے شروع کر دیئے تھے، اب یہ ڈرامہ ہی تو ہے کہ طبیعت اُس کی اتنی خراب تھی مگر مجھے نیچا دکھانے کو میری پھپھو ساس کے ساتھ ہسپتال چلی گئی - فیروزہ میری بچی ! وہ بیچاری کب سے بیمار تھی اور اُسے کوئی ڈاکٹر پر نہیں لے جا رہا تھا اور اُسے گھر کے سٹور میں زمین پر بستر ڈال کر دیا ہوا تھا۔ میں اُس دن باجی کے گھر گئی تو اُس نے منت سماجت کی اور میں اُسے ہسپتال لے گئی، اور بس پورے خاندان میں فون کر کے مجھے لعن طعن کر رہی ہیں -" میں اُن کے آنسو بھی پونچھتی اور تسلیاں بھی دیتی کہ " جمو خالہ! کوئی بات نہیں، ایک وقت آئے گا جب سب کو آپ کی قدر آ ہی جائے گی اور یقین کریں کہ ایک ایک شخص آپ کی تعریف کرے گا، قدر کرے گا۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں"۔ وہ مُسکرا کر کہتیں: " معلوم نہیں میری زندگی میں وہ دن کب آئے گا؟" اور میں چُپ چاپ اُن کے خوبصورت چہرے کو دیکھے جاتی - میری نظر میں صحیح معنوں میں وہ اندر اور باہر سے ایک خوبصورت شخصیت کی مالکہ تھیں - ہمدرد، غمگسار، کھلے دل اور دماغ کی تھیں - " ہر گھڑی تیار کامران ہیں ہم " کی تفسیر بنی سب کی خدمت کے لئے تیار رہتیں - اپنا ہو یا پرایا، دوست ہو کہ دُشمن، جو بھی مدد کے لئے پکارتا، لبیک کہتے ہوئے سر پر کفن باندھے چل پڑتی، چاہے مالی ہو

یا بدنی یہ بھی پرواہ نہ کرتیں کہ جیب میں پیسہ ہے کہ نہیں؟ اپنی صحت ٹھیک ہے یا نہیں؟ جس سے بھی پیار کیا ، دل سے کیا اور مرتے دم تک اُس پیار کو محبت کو نبھایا۔ اُن کے بچے اور میں بھی سمجھا سمجھا کر تھک گئے کہ " اپنی جان کو ہلکان مت کریں، سب مطلبی ہیں، جب آپ کی ضرورت ہوتی ہے تو آپ کے پاس بھاگے چلے آتے ہیں اور مطلب پورا ہوتے ہی یوں آنکھیں پھیر لیتے ہیں، جیسے جانتے ہی نہیں اور ساتھ ہی میں گنگنا اُٹھتی (بچپن کا شوق کہیں تو پورا کرنا تھا) اِس مطلبی دُنیا کو کوئی پیار سکھا دے۔" اور خالہ ہنس کر کہتیں: " میرے بچو! وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں بدلیں ۔" وہ ایسی ہی تھیں ہر دم ہنسنے اور ہنسانے والی ۔ میری بچپن سے دوست تھیں اور میں بہت اچھے سے جانتی تھی کہ اُن کے ہر دم ہنستے چہرے کے پیچھے کتنے آنسو، کتنے دُکھ چھپے ہیں، جنہیں وہ " چارلی چیپلن" کی طرح بارش میں بیٹھ کر بہاتی ہیں ۔ منافقت سے کوسوں دُور۔۔۔ اُن کی ڈکشنری میں ایسا کوئی لفظ تھا ہی نہیں مگر سب کو اُن سے کیا جلن تھی؟ جی ہاں! جلن ہی تو تھی، حسد ہی تو تھا، ورنہ انہوں نے کون سی کسی کی وراثت مار لی تھی جو سب اُن سے ہر وقت خار کھائے بیٹھے تھے اور بے عزت کرنے کا کوئی موقع نہیں گنواتے تھے۔ اُن کی ہر ہر خوشی پر رونا ڈالتے اور اپنی خوشیوں پر اُن سے لڈیاں ڈلواتے تھے۔ منظور چچا کے بیٹے کی شادی پر تو میں بھی اُن سے غصّے ہو گئی اور بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا کہ اُس سے چند روز پہلے ہی خالہ کی بیٹی کی منگنی پر پہلے تو وہ آ نہیں رہے تھے اور

جب منت سماجت کر کے آئے تو ایسے ناک منہ بنائے، گردن زرافے کی مانند یوں اونچی کیے بیٹھے تھے(میں نے تو بہانے سے جا کر چیک بھی کر لی کہ کہیں ماش کے آٹے سے کلف تو نہیں لگا لی؟ یا پھر مغل سٹیل کا سریا تو نہیں گھس گیا گردن میں) گویا ترکیہ کے" میرا سلطان" بیٹھے ہو۔ ناراضگی کی وجہ جب معلوم ہوئی تو دل کیا جا کر کہوں کہ اپنے گھروں میں تو بچی کی رخصتی کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ" آپ کو بتانا تھا کہ ننھی کی شادی کر دی بس مجھے بھی معلوم نہیں تھا، وہ تو دروازے پر ڈھول بتاشے کی آواز آئی تو پتا لگا اپنی ننھی کی بارات آ گئی ہے، ننھی نے ہم سب کو سرپرائز دیا ہے اور چھوٹو کا بیٹا جب تین دن کا ہو گیا تھا تو آپ لوگوں کو معلوم ہوا تھا کہ ہم دادا، دادی بن گئے ہیں اور دوسرا سانس بھی لے تو آپ کو بتا کر لے، چھینک بھی لے تو بتائے کہ آج دس بار چھینک لی تھی "۔ مگر ہائے رے! ہمارے اماں ، ابا کی تربیت جو قدم قدم پر ہمارا راستہ روک لیتی ہے(ٹریفک سگنل کی طرح) زندگی اسی طرح دُھوپ چھاؤں کی طرح گزر رہی تھی کہ اچانک سے چھوٹے ماموں کا روتے پیٹتے فون آ گیا: " ہائے ! ہماری پیاری جمو چلی گئی ۔" اور میں گنگ سی دل پر ہاتھ رکھے وہیں بیٹھ گئی، جب کچھ دیر بعد اوسان بحال ہوئے تو مرے مرے قدموں سے اٹھی اور خالہ کے گھر پہنچی تو ایک نیا ڈرامہ چل رہا تھا۔ اُن کے بچے اور میاں ایک کونے میں ایسے دبکے بیٹھے تھے جیسے انہوں نے سب کا اُدھار دینا ہو اور باقی سب اُن کے دائیں بائیں، اُن کی چارپائی پر، قدموں میں، بس نہیں چل رہا تھا کہ کفن

پہن کر ساتھ ہی لیٹ جائیں(سب کو محبت بھی تو دکھانی تھی نا) اتنے میں بڑی خالہ آئیں اور ہائے میری جان! میری شہزادی کہتے ہوئے دھڑام سے اُن کے اوپر گر گئیں اور وہ بین ڈالے کہ مجھے دو پل کو محسوس ہوا کہ جمو خالہ اُٹھ کر بیٹھ گئی ہیں اور اُن کے آنسو پونچھتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ" باجی آ جائیں، میری جگہ آپ لیٹ جائیں(کاش ایسا ممکن ہوتا تو میں ایسا ہی کرتی) سب نے اُن کی شان میں وہ قلابے ملانا شروع کیئے کہ میں پریشان کہ خالہ تھیں یا فرشتوں سے بھی بڑھ کر کوئی مخلوق تھیں اور جب جب یہ واقعات ہوئے تو میں کہاں تھی؟(شاید اسکول گئی ہوں گی) ہر طرف وہ چیخیں وہ واویلے تھے کہ اُن کی بیٹی نے مجھے کہا: " باجی! یہ کفن میں لپٹی ہماری امی ہی ہیں یا اِن کی ہیں؟" اور مجھے اتنے دُکھ میں بھی ہنسی آ گئی کہ لگ تو کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ جنازہ اٹھانے لگے تو روک دیا گیا کہ بڑے ماموں نے کہا ہے کہ "میرے آنے تک کوئی میری جمو کو ہاتھ تک نہیں لگائے گا ورنہ وہ ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔"(لو کر لو گل۔۔ انہی کے فون کے بعد تو خالہ کو اٹیک ہوا تھا۔۔ یہ بھی اُن متاثرین میں شامل تھے، جن کو ناراضگی تھی کہ ہمیں دعائے خیر میں کیوں نہیں بلایا تھا) میرا دل غم سے پھٹ رہا تھا کہ کیسے یہ سب دوغلے اِنسان ہیں۔۔ زندہ تھیں تو ساری زندگی رُلایا اور اب دیکھو! دُنیا دکھاوے کو کیسے" مگرمچھ کے تو کیا ڈائنو سار کے بھی آنسو بہا رہے ہیں) وہ بھانجی جس کا سارا جہیز ہی جمو خالہ نے بنایا تھا اور وہ ساری زندگی ایسے کانی کانی آنکھوں سے خالہ اور اُس کی بیٹی کو

دیکھتی تھی، کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھی آج وہ اُن سے لپٹی بار بار بے ہوش ہوتی جا رہی تھی اور ہوش میں آتے ہی کہتی: " میری پیاری خالہ سیدھی جنت کی حوروں کے ساتھ بیٹھی ہیں، مجھے اللہ نے دکھا دیا ہے، بس اب دل مطمئن ہے، اب میں ایک آنسو بھی نہیں نکالوں گی"۔
اور میں دل میں سوچ گئی کہ واقعی وہ جنتی خاتون تھیں جو تم جیسی کم ظرف کو بھی گلے لگاتی تھیں۔ اتنے میں آواز آئی: " میری پیاری فرشتہ بہن ۔۔ کہاں چلی گئی۔۔؟ کاش تیری جگہ میں چلا جاتا(دل کیا کہوں کہ جائیں اِن کے ساتھ ہی چلے جائیں ہم نے کون سا روکنا ہے آپ کو۔۔) میری اللہ لوک بہن، میری ولیہ بہن ۔۔ دیکھ کیسی تیری شان کے مطابق تیری قبر بناؤں گا، تیری پسند کے پودے اور تیرے سرہانے یہ بڑا سارا نیم کا درخت لگاؤں گا، جو تجھے ٹھنڈی ہوائیں دے گا،ایسی شاندار قبر ہو گی کہ وہ شہر کے دوسرے کنارے سے بھی پتا لگے گا کہ یہ جمو اللہ والی کی قبر ہے۔ اور میں تصور میں دیکھ رہی تھی کہ یہ بڑا سا مزار اور درختوں پر لٹکتی نیلی، پیلی، ہری کپڑوں کی کترنیں، مزار پر دھمال ڈالتے ملنگ اور ساتھ میں ماموں چندے کا ڈبہ لئے بیٹھے ہیں اور دوسری طرف بڑی خالہ" شف والی سرکار "بی جمو۔۔۔ جمو۔۔ جمو۔۔ کی پھونکیں مار رہی ہیں۔ چھوٹے ماموں لنگر بانٹ رہے ہیں، جگہ جگہ عرس کے بینر لٹک رہے ہیں (یہی تو المیہ ہے ہمارا، زندہ کو جینے نہیں دیتے اور مرے کو زندہ کر دیتے ہیں)اور میں دل پر غموں کا پہاڑ لئے وہاں سے نکل آئی کہ اِس سے زیادہ میری برداشت نہیں تھی۔

"غصہ: چند سیکنڈ کا طوفان، برسوں کا پچھتاوا"
(فاطمہ افضال)

ہم AI کو قابو کرنا سیکھ رہے ہیں، مگر اپنے غصے کو کب قابو کریں گے؟
ایک لمحہ رک کر سوچیے: ہم AI کو سمجھنے، روبوٹس کو کنٹرول کرنے اور مشینوں کو اپنے اشاروں پر چلانے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر کیا ہم نے خود کو، اپنے جذبات اور اپنے غصے کو قابو کرنا سیکھا ہے؟
غصہ ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر انسان کو غصہ آتا ہے۔ مسئلہ غصہ آنا نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ غصے کے لمحے میں ہم کیا بن جاتے ہیں۔
ایک اسکول میں ایک طالب علم کسی بات پر شدید غصے میں آ گیا اور اس نے ایک کرسی اٹھا کر استاد کی طرف ایسے انداز میں بلند کر دی جیسے وہ اسے نقصان پہنچا سکتا ہو۔ چند سیکنڈ کا یہ لمحہ بہت کچھ اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھا۔ استاد کا احترام، بچے کی تربیت اور اس کے مستقبل کا سوال۔
والد کو اطلاع دی گئی۔ اپنے بچے کی اس حرکت پر انہیں بھی شدید غصہ آیا۔ گھر پہنچنے پر بچے کو سخت ڈانٹ اور مار کا سامنا کرنا پڑا۔
ذرا سوچیے؛ ایک غلطی کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں جا پہنچی؟
بچہ غصے میں اپنا ضبط کھو بیٹھا، پھر بڑے کا غصہ بھی اسی غصے پر برس پڑا۔ جس لمحے بچے کو سمجھنے، سنبھالنے اور اپنے جذبات پر قابو پانے کا طریقہ سکھانے کی ضرورت تھی، وہاں غصے نے تربیت کی جگہ لے لی۔
یہی غصے کی سب سے خطرناک بات ہے: یہ ایک غلطی کو کئی نئی غلطیوں میں بدل دیتا ہے۔
ہم اکثر سختی کو تربیت سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ تربیت صرف سزا کا نام نہیں۔ تربیت یہ ہے کہ بچے کو اپنی غلطی سمجھنے، ذمہ داری قبول کرنے اور اپنے جذبات کو سنبھالنے کا ہنر سکھایا جائے۔
سائنس اور نفسیات بھی بتاتی ہیں کہ شدید غصے میں جسم اور دماغ فوری ردِعمل کی کیفیت میں چلے جاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن اور سانس تیز ہو سکتے ہیں، جسم میں تناؤ بڑھتا ہے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت متاثر ہو سکتی ہے۔ اسی لیے غصے کے چند سیکنڈ کبھی کبھی برسوں کے پچھتاوے کا سبب بن جاتے ہیں۔
ایک جملہ رشتہ توڑ دیتا ہے۔ ایک تھپڑ بچے کے دل میں خوف چھوڑ سکتا ہے۔ ایک غلط فیصلہ زندگی بھر یاد رہ سکتا ہے۔
اسلام نے غصے پر قابو پانے کو بڑی خوبی قرار دیا ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "جو غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔" (آلِ عمران: 134)
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ طاقتور وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے، بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔
آج ہم بچوں کو AI coding، اور robotics سکھا رہے ہیں، مگر کیا ہم انہیں emotional intelligence بھی سکھا رہے ہیں؟ ہم انہیں موبائل چلانا سکھاتے ہیں، مگر کیا یہ بھی سکھاتے ہیں کہ غصے میں اپنی زبان اور ہاتھ کیسے روکنے ہیں؟
مشین کو کنٹرول کرنا ٹیکنالوجی ہے؛ خود کو کنٹرول

کرنا کردار ہے۔
غصہ آئے تو فوراً جواب نہ دیں۔ رکیں۔ سانس لیں۔ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو جائیں۔ پیچھے ہٹیں۔ سوچیں۔ پھر بولیں۔
اور والدین کے لیے سب سے اہم بات: بچے ہماری نصیحت سے زیادہ ہمارے رویے سے سیکھتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ بچہ غصے میں چیخے نہیں، ہاتھ نہ اٹھائے اور بدتمیزی نہ کرے، تو اسے یہ سبق سب سے پہلے ہمارے اپنے عمل میں نظر آنا چاہیے۔
بچے کو غصہ سنبھالنا سکھانے سے پہلے ہمیں اپنا غصہ سنبھالنا سیکھنا ہوگا۔
کیونکہ بچے صرف ہماری بات نہیں سنتے، وہ ہمیں دیکھتے ہیں۔
رک جانا ہار نہیں۔ خاموش ہو جانا کمزوری نہیں۔ معاف کر دینا شکست نہیں۔ اور خود کو قابو کر لینا اصل فتح ہے۔
غصہ چند لمحوں کے لیے انسان کو طاقتور محسوس کرا سکتا ہے، مگر اپنے آپ پر قابو رکھنے کی طاقت انسان کو پوری زندگی مضبوط بناتی ہے۔

"جھوٹ کا سرطان"
(سمیرا شفق)

جس طرح انسان کے جسم میں خون کا سرطان دھیرے دھیرے رگ و پے میں اترتا ہے اور بہت خاموشی سے زندگی کی جڑوں کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ قوتِ مدافعت کو نگل لیتا ہے۔
اسی طرح رشتوں اور تعلقات میں جھوٹ ایک خاموش اور مہلک سرطان ہے خواہ بولنے والے کو وہ کتنا ہی بے ضرر لگتا ہو، بظاہر نرم اور ریشم سے لہجوں کے لباس میں لپٹا ہوا، مگر حقیقت میں اعتماد کی ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دینے والا انتہائی خوفناک مرض ہے جو رشتوں کی رگوں میں اتر کر سچائی اور خلوص کے لہو کو چاٹ لیتا ہے اور سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس مرض کے شکار شخص کو ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ خود کو اور خود سے منسلک رشتوں کو موت کی وادی میں اتار رہا ہے۔ منفیت اور ڈھٹائی اس مہلک مرض کے آخری مراحل ہیں جس کے بعد رشتوں میں اترنے والا یہ زہر لا علاج ہو جاتا ہے۔ اعتبار و یقین کی سانسیں گھٹنے لگتی ہیں، محبت کی نبضیں بہت مدھم اور سست پڑ جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ رشتے ایک مردہ وجود کی طرح بے رنگ اور کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دن ہمیشہ کیلیے ختم ہو جاتے ہیں۔
سچائی رشتوں کے لیے زندگی کا روشن چراغ ہے اور جھوٹ؛ ان کی خاموش موت۔ اگر تعلقات کو دیرپا اور پُراثر بنانا ہے تو انہیں سچ کے صحتمند خون سے سینچنا پڑتا ہے، ورنہ جھوٹ کا سرطان

والدین اپنے بچوں کو جان بوجھ کر تکلیف نہیں دیتا، ان کا بس نہیں چلتا ورنہ وہ اپنے بچوں کے نصیب کے سارے دکھ ہمارے مقدر میں لکھ لیں۔ گلِ کے ابا نے بھی اس کی زندگی کو مزید خوار ہونے سے بچانے کے لیے سخت فیصلہ لیا۔

"ابا! میں تم پہ اب بوجھ بن گئی ہوں کیا جو میرے ساتھ یہ سب کیا جا رہا ہے؟"

سسکتے ہوئے گلِ اپنے والد کے پاس آئی جب اسے پتا چلا کہ اگلے ہفتے اس کا نکاح ہے۔

"نہیں بیٹا! اولاد والدین پر بوجھ نہیں ہوتی، تم تو میرے جگر کا ٹکڑا ہو۔"

گلِ کے ویران چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے سعید نے کہا۔

" تو یہ سب کیوں کر رہے ہیں؟ کون بھلا اپنے جگر کے ٹکڑے کے ساتھ ایسا کرتا ہے؟"

گلِ چیخ اٹھی۔

"بیٹا! یہ سب تمہاری بھلائی کے لیے کر رہا ہوں۔ میں یا تمہاری ماں ہمیشہ زندہ نہیں رہنے والے۔ ہمارے آنکھیں موندنے کی دیر ہے یہ دنیا تمہیں کاٹ کھائے گی۔"

باپ کے لاکھ سمجھانے پر بھی گلِ نہ مانی لیکن اس کی عزت کا خیال رکھتے ہوئے دہلیز چھوڑنے پر دل آمادہ بھی نہیں ہوا۔

سرمئی شام نے آسمان پر اپنا رنگ اوڑھا اور سارے پرندے اپنے گھر لوٹنے کی تیاری میں لگ گئے۔ اچانک موسم نے انگڑائی لی اور کالی گھٹا چھا گئی۔ چہار سو سیاہ بادل چھا گئے، مغرب کا وقت ہوا تو اذان کی آوازیں فضا میں گونجنے لگی۔

گلِ ہاتھ میں اسفند یار کی تصویر لیے زاروقطار روئے جا رہی تھی۔ وہ مسلسل ٹکٹکی باندھے اسفند کو دیکھے جا رہی تھی جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

اس نے نظریں اٹھا کے دیکھا تو سامنے زینب کو کھڑا پایا۔ وہ گومگو کی کیفیت سے دوچار تھی لیکن ایک آس اور امید کا دامن تھام رکھا تھا۔ وہ اٹھی اور دوڑ کر زینب کے گلے لگ کے زور زور سے رونے لگی۔ اس کے اندر کا طوفان باہر آنسوؤں کی شکل میں نکل رہا تھا۔ کافی دیر رونے کے بعد زینب نے گلِ کو خود سے الگ کیا اور بیڈ پر بیٹھا کر پانی پلایا۔

"گلِ! کیا حالت کر لی ہے اپنی، معاشرے کی بے حسی اور درندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہی تمہارے ابا نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ تم کیوں نہیں مانتی یہی تمہارے لیے درست ہے۔"

زینب گلِ کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔

"بننے دیں مجھے اس بے حس معاشرے کی درندگی کا حصہ۔"

گلِ کی بات پر زینب نے خاموشی اختیار کی پھر بولی:

"اولاد والدین کا دکھ تب سمجھتی ہے جب وہ خود والدین بنتے ہیں۔ اسفند یار تمہیں جان بوجھ کے چھوڑ کر نہیں گیا۔ اس دنیا میں ہر انسان نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو ہم تم پر یہ فیصلہ مسلط نہ کرتے۔"

اپنی ماں کی بات سن کر گلِ سکتے میں پڑ گئی۔اس کا خیال تھا کہ اس دنیا میں جوان لڑکی کا بیوہ ہونا ایک عام سی بات ہے۔ لوگ آسانی سے اسے جینے دیتے ہیں، وہ اس بات سے غافل تھی کہ اگر ماں باپ کا سایہ بھی اس کے سر سے اٹھ

جائے تو یہ لوگ اسے زندہ کھا جائیں گے۔
اپنے ماں باپ کے فیصلے کو غلط مانتے ہوئے آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب گلِ اپنے ابا کے دوست کے بیٹے زبیر کے ساتھ باعزت رخصت ہو گئی، لیکن گلِ کے رخصت ہوتے وقت کے الفاظ زینب کو بے چین کر رہے تھے۔
"میں تم لوگوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔"
چند سال بعد۔۔۔۔۔
"ابا۔۔۔ اماں۔۔۔! میں آج آپ سے آخری بار ملنے آئی ہوں، پھر نجانے کب آپ سے ملاقات ہو۔ میں زبیر کے ساتھ ملک چھوڑ کے جا رہی ہوں۔ جاتے جاتے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں کہ آپ لوگوں نے اس وقت اگر یہ فیصلہ نہ کیا ہوتا تو آج میں بھی در بدر پھر رہی ہوتی۔"
مٹی کے ڈھیر پر گلاب کے پھول کی پتیاں ڈالتے ہوئے گلِ نے کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ اس کے بس میں نہیں تھا کہ وہ گزرا وقت واپس لا سکے اور والدین کے اس فیصلے پر ان کو گلے لگا کر شکریہ ادا کر سکے، لیکن اسے یقین تھا کہ زمین کے نیچے سوتے دو وجود شاید آج اپنی بیٹی کو خوش دیکھ کر خوش ہوں گے۔

"بیوہ ماں کی ڈاکٹر بیٹی"
(رامین محمد شاہد)

عائشہ ایک کامیاب ڈاکٹر بن چکی تھی۔ شہر میں گاڑی کا حادثہ پیش آیا۔ اسپتال کی ایمرجنسی میں عائشہ بھی موجود تھی۔ اچانک، اس کی نظر ایک لڑکے پر پڑی۔ وہ اسے دیکھ کر سکتے میں چلی گئی۔ گھبراہٹ اور خوف اس کے چہرے پر آ چکا تھا۔ زخمی نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا، "مجھے معاف کر دو۔" عائشہ کے حلق میں آنسو اٹکے، پھر اس نے زخمی کی مرہم پٹی کی۔ اس لڑکے کی جان بچ گئی تھی۔ عائشہ اسپتال سے ساحلِ سمندر چلی گئی تھی۔ وہ لہروں کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ لہریں اس کے پاؤں کو چھوتیں اور پیچھے چلی جاتیں۔ وہاں بیٹھے اسے اپنی بیوہ ماں کا خیال آیا، جب اس کے ابو اس دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، پھر رشتے داروں نے ان سے کیسا رویہ اختیار کیا تھا۔
عائشہ اس وقت یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اس کی نسبت اس کے چچا زاد سے طے تھی۔ ایک دن اس کا گروپ لیبارٹری جا رہا تھا۔ عائشہ اور اس کا گروپ یونیورسٹی کی سیڑھیاں اتر ہی رہے تھے۔ اچانک، سامنے سکندر آ گیا اور طنز کرنے لگا، "یونیورسٹی میں لڑکوں کے ساتھ گھومنے جاتی ہو۔" عائشہ کچھ بولتی، وہ جا چکا تھا۔ عائشہ نے اپنا حجاب صحیح کیا۔ آنکھوں سے نکلنے والے آنسو حلق میں اٹک گئے تھے۔ وہ سب وین میں بیٹھے اور لیبارٹری چلے گئے تھے۔
عائشہ گھر واپس آئی تو خاندان والے اس کے گھر پر ہی موجود تھے۔ وہ جیسے ہی گھر میں داخل

ہوئی، تو دیکھا امی رو رہی ہیں اور باقی سب کی اونچی اونچی آوازیں محلے تک پہنچ رہی تھیں۔
عائشہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر والے کمرے میں گئی۔ سب کو سلام کرنے والی تھی، اس سے پہلے ہی اس کی چچی نے بولا، "باپ تو مر گیا، ہماری عزت کا ہی تھوڑا خیال کر لیتیں۔" سکندر بھی وہیں موجود تھا۔ اس نے بھی عائشہ کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں۔ مزید اس نے کھڑے کھڑے عائشہ سے رشتہ توڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی ماں ان سے التجائیں کر رہی تھیں، "ایسا نہیں کرو۔" صوفے پر بیٹھی چچی بھی اب کھڑی ہو کر اپنے بیٹے کا ساتھ دے رہی تھیں۔ چچی نے اس کی امی کو بہت سنائی، "کیسی تربیت کی ہے تم نے اکلوتی بیٹی کی۔" وغیرہ وغیرہ۔ عائشہ کو صفائی دینے کا موقع نہیں ملا۔
سب خاندان والوں نے ان سے کہا، "یہاں سے چلے جائیں، تاکہ ان کی عزت خراب نہ ہو۔"
سب کے جانے بعد عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنی ماں کو تھامتے ہوئے صوفے پر بٹھایا، اور دونوں ماں بیٹی گلے مل کر رونے لگیں۔ اس کی امی نے اس سے کہا، "اب تم تعلیم ختم کر دو۔ ڈاکٹر بننے کا خواب بھول جاؤ۔ زمانہ بن باپ کی بچی کو جینے نہیں دیتا۔"
دوسرے دن عائشہ یونیورسٹی نہیں گئی تھی۔ صبح اٹھ کر اس نے خود ناشتہ بنایا، اپنی امی کو اپنے ہاتھوں سے کھلایا، اور پھر نیچے چچا کے پورشن میں چلی گئی۔ اسے سیڑھیاں اترتے دیکھ کر چچا اور سکندر رک گئے۔ باورچی خانے سے اس کی چچی بھی آ گئی۔ پھر عائشہ نے اپنی امی کا زور سے ہاتھ تھاما۔ چہرہ بے خوف تھا، دل اندر سے رو رہا تھا، لیکن اس نے بہت مضبوطی سے بولا، "چچا، آپ ہمیں ہمارا حصہ دے دیں، ہم چلے جائیں گے۔"
چچا کچھ کہتے، اس سے پہلے ہی سکندر بول پڑا، "بدکردار عورت! شرم نہیں آتی؟ کیسے دلیری سے حصہ مانگ رہی ہو؟ تمہارا باپ مر گیا، کوئی حصہ نہیں ہے تمہارا۔" اس کی چچی نے بھی عائشہ کی کردار کشی کی، اور ساتھ فوراً گھر سے نکلنے کا بول دیا۔ عائشہ کچھ بولنا چاہ رہی تھی۔ اس کی امی نے اس کا ہاتھ پکڑا، اور اسے سیڑھیوں سے اوپر لے گئی تھیں۔
الماری کا دروازہ کھولتے ہوئے نجمہ نے بولا، "تم بھی ضرورت کا سامان لے لو، ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔" عائشہ خاموشی سے کرسی سے اٹھی، ایک بیگ اٹھایا، اور سامان پیک کرنے لگی۔ پھر دونوں ماں بیٹی نے اپنے باپ کے گھر کو الوداع کہا اور نانی کے خالی گھر چلی گئیں۔ وہاں پر سب کچھ بھلا کر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ دو سال بعد ہی وہ ڈاکٹر بن چکی تھی۔ سرکاری ہسپتال میں اسے پانچ گھنٹے کی ڈیوٹی پر تعینات کر دیا گیا تھا۔ ہر روز نئے نئے کیسز دیکھ کر اس کا دل مضبوط ہو چکا تھا۔ اب اسے ایمرجنسی میں بھی جانا پڑتا تھا۔
عائشہ نے سفید کوٹ پہنا، اور فروزی رنگ کا اسکارف گردن کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ عائشہ نے کار کا دروازہ کھولا، فرنٹ سیٹ پر اپنی امی کو بٹھایا، خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی، اور کار چلانا شروع کر دی۔ اس کی امی راستے بھر پوچھتی رہیں، "کہاں جا رہی ہو؟" اس نے ایک جگہ گاڑی روکی۔ وہاں سے سفید پھولوں کا بوکے

خریدا، اور گلاب کے دو گجرے لے کر واپس کار میں آ گئی۔ اپنی امی کو گجرے دیے، اور کہا "امی، جلدی سے پہن لیں۔"
بیوگی کے بعد انہوں نے کبھی گجرے دیکھے بھی نہیں تھے۔ ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ اسی لمحے عائشہ نے گاڑی روک دی اور کہا، "امی، جلدی سے گجرے پہن لیں۔" وہ کھڑکی سے باہر عائشہ کی دوستوں کو دیکھ ہی رہی تھیں۔ اچانک عائشہ نے دروازہ کھولا اور کہا، "امی، آ جائیں۔" وہ ہجوم دیکھ رہی تھیں، کچھ پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ اس سے پہلے عائشہ نے ان کا ہاتھ تھاما، اور ایک دروازے کے آگے آ گئیں، جہاں ایک لال ربن بندھی ہوئی تھی۔ اس نے ماں کے ہاتھ میں قینچی دیتے ہوئے کہا، "امی، افتتاح کریں، یہ میرا پرائیویٹ کلینک ہے۔"
نجمہ کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہنے لگے، اور وہ عائشہ کو ڈھیروں دعائیں دینے لگیں۔ خوشی میں انہوں نے بولا، "تمہارے ابو زندہ ہوتے تو بہت خوش ہوتے۔" عائشہ کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ ساتھ ہی نجمہ نے ربن کاٹا، اور تالیوں کی آواز گونجنے لگی۔ بہت سارے لوگوں نے مختلف قسم کے تحائف دیے۔ نجمہ نے عائشہ کو مبارک باد دیتے ہوئے وہی سفید پھولوں والا بوکے اس کو دیا تھا۔
عائشہ پرائیویٹ کلینک میں بھی بیوہ عورتوں سے فیس نہیں لیتی تھی۔ ایک رات اسپتال سے ایمرجنسی کا میسج آیا۔ عائشہ رات کے دو بجے ہسپتال پہنچی۔ ایمبولینس کی آوازیں، اسپتال میں افراتفری کا منظر تھا۔ اسی اثنا میں اس کی نظر سکندر پر پڑی۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ ساتھ والے بیڈ پر اس کے چچا تھے، جو حادثے میں اپاہج ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کا دل اندر سے چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کے اندر کی چیخ نے سمندر کا شور بھلا دیا تھا۔
سمندر کنارے بیٹھے بہت دیر ہو چکی تھی۔ لہریں اب اونچی ہو چکی تھیں۔ اسی دوران غازی اس کی امی کو لے کر ساحل پر پہنچا۔ غازی نے آواز دی، "عائشہ!" پیچھے مڑتے ہوئے وہ بے ہوش ہو گئی۔
ہوش میں آئی تو وہ اپنے گھر میں تھی۔ اس کی امی اس کے پاس بیٹھی تھیں۔ ایک نظر ٹی وی پر پڑی، جہاں نوبل انعام ملنے والوں کے ناموں کی فہرست دکھائی جا رہی تھی۔ بریکنگ نیوز آ رہی تھی، "پاکستان کی ڈاکٹر عائشہ نوبل انعام کے لیے منتخب ہو گئی ہیں۔"
دوسری طرف سکندر کی ماں نے ٹی وی پر وہی خبر دیکھی۔ ایک نظر اپنے اپاہج شوہر پر ڈالی۔ ایک لمحے میں ماضی کا سارا منظر چچی کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا، اور وہ شرمندہ ہوئیں، لیکن معافی مانگنے کا حوصلہ پیدا نہ کر سکیں۔
کچھ دنوں بعد عائشہ اپنی امی کے ساتھ چچا کو اپنی شادی کا کارڈ دینے گئی۔ سکندر اب بھی بے روزگار تھا۔ چچی کی اکڑ بھی خاک ہو چکی تھی۔
نجمہ نے ایک نظر آسمان کی طرف دیکھا، اور دل ہی دل میں بولنے لگیں، "بے شک، اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔"

"چالان"
(آسیہ بی بی)

کوٹھری میں رات بھر جلے سگریٹوں کا دھواں کچھ یوں بسا تھا جیسے کسی غریب کا دکھ سینے میں ٹھہر جاتا ہے۔ چارپائی پر بچھی میلی چادر کی سلوٹیں گواہ تھیں کہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹی ہے۔ باہر دالان میں صبح کی سفیدی پھیل چکی تھی، مگر اس کے دل کا اندھیرا چھٹنے کا نام نہ لیتا تھا۔

اس نے چائے کی پیالی اٹھائی، بمشکل ایک گھونٹ حلق سے اتارا اور پیالی تپائی پر رکھ دی۔ نجانے کیوں، آج اسے ہر چیز ادھوری چھوڑنے کو جی چاہ رہا تھا۔ شاید مسلسل محرومیوں نے اسے اندر سے یوں کھوکھلا کر دیا تھا کہ اب اسے ادھورے پن سے ہی انسیت سی ہو گئی تھی۔

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو انگلیاں چند کڑکراتے نوٹوں سے ٹکرائیں۔ ساتھ ہی ایک پرچی بھی تھی۔ اماں کی دوا کی پرچی۔ کل رات شیشی کی آخری خوراک بھی ختم ہو چکی تھی۔

میلے آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھا۔ دھنسی ہوئی آنکھیں، بکھری داڑھی اور اترا ہوا چہرہ۔

اسے اپنا آپ پرانے صندوق میں پڑے اس ٹوٹے ہوئے کھلونے سا لگا جو پچھلے دنوں صفائی کرتے ہوئے ملا تھا۔ تب بچپن میں کھلونا ٹوٹنے پر وہ کیسا دھاڑیں مار کر رویا تھا اور اماں نے اسے فوراً سینے سے لگا کر چپ کرایا تھا۔ مگر اب... اب دکھ اس قدر جان لیوا تھے کہ سینے میں سما نہ پاتے تھے، اور ان دکھوں کو بہلانے والا کوئی نیا کھلونا بھی بازار میں نہیں بکتا تھا۔

میز کے کونے پر رکھا وہ خاکی لفافہ اسے منہ چڑا رہا تھا جس میں اس کی برطرفی کا پروانہ تھا۔ کرایہ، بچوں کی فیس، گھر کا راشن اور اماں کی دوائیں سب کچھ ان چند سطروں کی نذر ہو گیا تھا۔

باہر صحن سے اماں کی کمزور آواز آئی، "ارے بیٹا! آج دفتر نہیں گیا؟"

وہ چوکھٹ پر کھڑی تھیں۔ سفید ململ کے دوپٹے سے جھانکتا جھریوں بھرا چہرہ، اور موٹے شیشوں والی عینک کے پیچھے وہ دھندلی آنکھیں جو بغیر کہے بچوں کے چہرے کا رنگ پل میں پڑھ لیتی تھیں۔

وہ پلٹا۔ بمشکل تھوک نگل کر بولا، "نہیں اماں اب دفتر والوں کو میری ضرورت نہ رہی۔"

اماں کے چہرے پر ایک لمحے کو دکھ کا سایہ لہرایا مگر پھر وہ ممتا کے بھرپور لہجے میں بولیں، "دل چھوٹا نہ کر میرے لال، اللہ بڑا کارساز ہے۔" وہ جانتی تھیں کہ ماں کے آنسو بیٹے کو مزید توڑ دیں گے۔

اس نے مسکرا کر سر ہلا دیا، "سب ٹھیک ہو جائے گا اماں۔"

وہ پرچی اور بائیک کی چابی اٹھا کر باہر نکل آیا۔ سڑکوں پر صبح کا غلغلہ تھا۔ ہر کوئی اپنی روزی روٹی کی فکر میں ہانپ رہا تھا۔ وہ بھی اسی دوڑ میں شامل تھا، بس آج اس کی منزل اماں کی دوائیں تھیں۔

چوراہے پر مڑتے ہی ایک کڑکدار سیٹی نے اسے چونکا دیا۔ ٹریفک والے سپاہی نے آگے بڑھ کر بائیک کی چابی نکال لی۔ خاکی وردی میں کسا ہوا اس کا بھاری بھرکم وجود اور ہاتھ میں گھومتا ڈنڈا

جیسے کسی ان دیکھے جبر کی علامت تھا۔
"ہیلمٹ کہاں ہے میاں؟ گھر بھول آئے؟"
سپاہی نے طنزیہ نظروں سے اسے گھورا۔
"وہ؛ اماں سخت بیمار ہیں۔ دوا لینے جا رہا تھا، جلدی میں دھیان نہ رہا۔"
"تو کیا ہم یہاں مکھیاں مارنے کھڑے ہیں؟ نکالو دو ہزار، چالان کٹے گا۔"
دو ہزار؟ اس کی تو جان ہی نکل گئی۔ جیب میں کل جمع پونجی ہی اتنی تھی۔
"صاحب" اس کے ہاتھ کانپنے لگے، اس نے پرچی آگے کر دی، "یہ دیکھ لیجیے، یہ تو اماں کی دوا کے پیسے ہیں۔ خدا کے لیے جانے دیجیے، میرے پاس اور کچھ نہیں۔"
سپاہی نے پرچی کو حقارت سے جھٹک دیا، "مجھے کہانیاں نہ سناؤ، پیسے نکالو!"
وہ اندر تک کرچی کرچی ہو گیا۔ آج کوئی ماں نہیں تھی جو اس ٹوٹے ہوئے وجود کو سینے سے لگا لیتی۔ اس بے حس دنیا میں غریب کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔
اسی پل اس کی جیب میں رکھا موبائل بجنے لگا۔ سکرین پر 'پیاری اماں' جگمگا رہا تھا۔
اس نے کانپتے ہاتھوں سے فون نکالنا چاہا، مگر اچانک سینے میں ایک ایسا جان لیوا درد اٹھا کہ دن کے اجالے میں رات کا اندھیرا چھا گیا۔
سڑک کا شور، سپاہی کی کرخت آواز؛ سب کچھ دور، بہت دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے ہاتھ سے بائیک کا ہینڈل چھوٹا اور وہ سڑک کی دھول پر گر پڑا۔ فون چھٹک کر دور جا گرا تھا، مگر اب بھی بج رہا تھا۔

"فائزہ شہزاد (خیبر پختونخوا کی پہلی مزاح نگار خاتون) کے ساتھ ایک نشست"

1: اپنے بارے میں بتائیے، پورا نام/ قلمی نام/ تعلیم وغیرہ

فائزہ شہزاد: السلام علیکم!

میرا نام فائزہ شہزاد ہے۔ چھوٹی سی مصنفہ (ادب اطفال و ادب عالیہ) کالم نگار، ادنٰی سی نعت گو، نعت خواں ہوں، شاعرہ میں نہیں مگر ناجانے چہرے سے میں شاعرہ لگتی ہُوں کہ اکثر میرے نام کے ساتھ شاعرہ اور وہ بھی نامور لکھ دیتے ہیں (بلکہ بہت سے ڈاکٹر بھی کہتے ہیں)۔ میرا کوئی قلمی نام نہیں، اپنے اسی نام سے لکھتی ہُوں۔

2- ادارہ: کس شہر میں پیدا ہوئے/ کہاں پلے بڑھے/ اور اب کس شہر میں مقیم ہیں؟

فائزہ شہزاد: میں 14 اگست کو پھولوں کے شہر پشاور میں پیدا ہوئی، بقول بڑی بہنوں کے "پیدا ہوتے ہی بٹر بٹر دیکھ کر مُسکرا رہی تھی کہ سب پہلے ڈر گئے کہ شاید کوئی دوسری مخلوق پیدا ہو گئی ہے (لو جی کر لو گل آج کے دور میں پیدا ہوتی تو دو منٹ میں پوری دُنیا میں وائرل ہو جاتی اور کسی مارننگ شو کی بھی زینت بن جاتی) سب گھر والوں کی بے حد لاڈلی تھی۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں آگے آگے تھی۔ شرارتی حد سے زیادہ تھی آرام سے بیٹھنا میری ڈائری میں نہیں تھا، ابو نے تو نام ہی شیطان کی نانی رکھا ہوا تھا (سادہ دور کے سادہ پیار بھرے نام)

اور کلاس ون (فارورڈ گرلز ہائی سکول) سے لے کر میٹرک تک ٹاپر تھی بلکہ میٹرک میں ضلع پشاور میں اول پوزیشن لی اور گورنر فضل حق مرحوم کی طرف سے ہم سب پوزیشن ہولڈرز کو انعامات سے نوازا گیا (گورنر ہاؤس میں) ابھی گورنمنٹ فرنٹیئر کالج میں جا کر چھوٹے چھوٹے "پر" نکلنا شروع ہوئے ہی تھے کہ اُن کو بے دردی سے کاٹ دیا گیا اور مجھے (ساہیوال) سُسرال بھیج دیا گیا، سب خواب نیست و نابود ہو گئے اور اُس شوخ و چنچل سی بچی نے ایک مدبر بیوی، بڑی بہو، ماں بن کر خود کو اپنی چھوٹی سی جنت میں گم کر لیا۔

3- ادارہ: ادب سے لگاؤ کیسے اور کب ہوا/ اب تک کی ادبی و تخلیقی خدمات؟

فائزہ شہزاد: ادب سے دُور دُور تک لگاؤ نہیں تھا۔ پہلے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا، پھر اداکارہ و گلوکارہ بننے کا بھوت سوار ہو گیا (شاید اسی لئے گھر والوں نے دیس نکالا ساہیوال دے دیا تھا) اسکول اور کالج میں دونوں شوق پورے کیے اور اِس سلسلے میں ریڈیو اسٹیشن تو کافی بار اور پی ٹی وی میں دو بار جانا ہوا۔ بچوں کے رسالے پڑھا کرتی تھی اور کبھی کبھار کہانیاں بھی لکھیں۔ پیپرز میں خود سے بنا کر کہانیاں لکھا کرتی تھی (اُردو، انگلش) اور اُردُو سے میں ایسے بھاگتی تھی یہ نہیں کہ میں کوئی انگلش کی شکسپیئر تھی بس ویسے ہی اُردو مشکل لگتی تھی (کالج میں پورا ایک مہینہ کلاس بنک کی تھی، بہت طویل ہو جائے گا ورنہ پورا واقعہ بیان کرتی) شادی کے بعد سب کچھ چھوڑ چھاڑ دیا مگر 1992 میں میرے میاں جی شہزاد انور مرحوم کی جاب چلی گئی (وہ بینک میں تھے اور کچھ کوآپریٹیو بینکس حکومت کی طرف سے ختم کر دیئے گئے تھے۔ بہت دل دکھانے والے واقعات ہیں اِس بارے میں بھی) بہت کڑا وقت تھا، میرے پاس صرف ایف اے کی ڈگری تھی جو کہ بہت کم تھی تعلیمی لحاظ سے کیونکہ دُنیا بہت آگے نکل چکی تھی اُس وقت مجھے احساس ہوا کاش میرے پاس کوئی بڑی ڈگری ہوتی تو میاں جی کا ہاتھ بٹاتی (اور اُس وقت تہیہ کر لیا تھا کہ بچوں کو خوب پڑھاؤں گی، تاکہ مشکل وقت میں کوئی تو سہارا ہو) پھر بھی اللہ پاک نے مدد کی اور بیٹی کے اسکول میں ہی جاب مل گئی (نرسری ٹیچر) ساتھ میں ٹیوشنز شروع کیں۔

شہزاد صاحب نے کزن کے ساتھ مل کر راجن پور میں ٹھیکیداری شروع کی مگر کزن کی اچانک وفات ہو گئی تو پھر اپنے شہر پشاور بزنس کے سلسلے میں شفٹ ہوئے۔ اپنے شہر کی ہواؤں میں آتے ہی تعلیم کے شوق نے سر اُٹھایا (تعلیم کا شوق کیا جنون تھا) اور گھر والوں سے کہا کہ میں پرائیویٹ پڑھ لوں گی سب کام بھی کروں گی، بس مجھے پڑھنے دیں، کسی کو کوئی گلہ نہیں ہو گا (جوائنٹ فیملی تھی) بس جی اجازت ملتے ہی پہلے گریجویشن کیا (شادی کے 11 سال بعد) اُس وقت بیٹی ڈاکٹر سعدیہ شہزاد کلاس 4 میں اور ڈاکٹر محمد عمر بن شہزاد دو / ڈھائی سال کا تھا۔ گھر کے کام کرتے ہوئے بھی کتاب ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ایک ہاتھ سے ہنڈیا بن رہی ہوتی اور دوسرے میں کتاب۔ اِس کے بعد ایم اے اسلامیات کے دوران کچن کی کھڑکی سے باہر کچرے کے ڈھیر سے پیارے گول مٹول بچے کو

کھانے کی چیزیں چُن کر کھاتے دیکھا تو اچانک سے ذہن میں آیا کہ "گلُ پھینکے ہوئے ہیں" فوراً کاغذ قلم لیا اور اسی عنوان سے مشرق اخبار میں کالم لکھ ڈالا جو بہت پسند کیا گیا، پھر اُس کے بعد پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور اخبارات میں کالم، انٹرویوز، سروے رپورٹس لکھیں اور خواتین کے مسائل پر بہت لکھا، اِس کے ساتھ ہی مختلف ڈائجسٹس میں بھی لکھا مگر صرف سچی کہانیاں؛ کیونکہ شادی کے بعد اچھے سے معلوم ہو گیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور افسانہ کیا ہے؟ میں نے 1998 میں کالم نگاری سے آغاز کیا، اُس وقت پشاور میں بہت سے لوگ کالم لکھ رہے تھے جن میں مرد حضرات زیادہ تھے اور وہ بھی بہت نامی گرامی کالم نگار جب کہ خواتین بہت کم تھیں، میں نے جب لکھنا شروع کیا تو بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اتنی پزیرائی حاصل ہوگی، ایک جنون سا تھا۔ جہاں جاتی لوگوں کے انٹرویوز کرتی، سروے کرتی، اکثر میاں جی سے ڈانٹ بھی پڑتی کہ کیا ہر جگہ شروع ہو جاتی ہو، مگر مشرق اخبار کی طرف سے جب جاب کی آفر ہوئی تو میں نے کالر جھاڑتے ہوئے کہا "ہلکا مت لیں مجھے" مجھے خواتین کے ادبی صفحے کی انچارج کی آفر ہوئی تھی مگر بس گھریلو مصروفیات کی وجہ سے نہ کر سکی، شوبز کے فنکاروں کے بھی انٹرویوز کیے (یہ سب 98 سے 2000 تک) ایم اے (اسلامیات) کی جب ڈگری ملی تو چھوٹا بیٹا محمد عمیر 6 ماہ کا تھا۔ 1995 میں پشاور شفٹ ہوئی ساہیوال سے اور 1999 میں ماسٹرز بھی کر لیا تھا اور دُھواں دھار لکھ بھی رہی تھی، آگے ایم فل کا ارادہ تھا ساس کی اچانک وفات سے دل ٹوٹ سا گیا اور فارم پھاڑ کر پھینک دیئے۔

ساتھ ساتھ چھوٹی چھوٹی نظمیں، آزاد نظمیں بھی لکھیں۔ مگر پھر بیٹی کی شادی کے بعد اُس کے بچوں کی خاطر سب کچھ چھوڑ دیا (چونکہ وہ ڈاکٹر تھی، جاب کرتی تھی تو پھر مجھے بچوں کو گھر کو دیکھنا ضروری تھا) کرونا کے دنوں میں دوستوں اور بچوں کے کہنے پر دوبارہ قلم اُٹھایا اور اللہ پاک کا شُکر ہے کہ یہ سفر جاری ہے۔

ابھی تک تقریباً 15 سے زائد انتھالوجی بُکس میں لکھا ہے۔ (ٹھیک سے تعداد بھی یاد نہیں لوگوں نے پڑھنے کے لیے لی اور پھر واپس نہیں ملیں) اپووا میگزین میں لکھتی ہُوں۔ جذبہ پوسٹ شکاگو میں کالمز اور افسانچے شائع ہوتے ہیں۔ بچوں کے میگزین "کونپلیں" میں لکھتی ہُوں اِس کے علاوہ انڈیا کے اخبار میں بھی لکھا بلکہ بچوں کی لوریاں بھی لکھی ہیں، کسوٹی اخبار پشاور میں "پُتلی تماشا" کے نام سے کافی کالمز لکھے ہیں، کووڈ کے دنوں میں ٹریک بدلا اور طنز و مزاح کو اپنایا (دل میں سوچا کہ بس بہت رو دھو لیا اب کچھ ہنسنا ہنسانا بھی ہونا چاہیئے) پھر سب کا اصرار تھا کہ کتاب لکھو، بچوں کو شوق تھا کہ امی کی کتاب ہو، مگر ناجانے کیوں میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر بشریٰ فرخ صاحبہ (کاروان حوا لٹریری فورم کی چیئر پرسن اور صدارتی ایوارڈ یافتہ) جو مجھے بہت پیار اور محبت دیتی ہیں ایک بڑی بہن ایک دوست کی طرح، انہوں نے دن رات طعنے دینا شروع کردیئے کہ کتاب کہاں ہے؟ اور میں ہنستی کہ بشریٰ جی! ساس تو نہ بنیں۔" شہزاد صاحب کی بیماری اور پھر وفات کی وجہ سے کتاب نامکمل رہ گئی۔

میری خواہش تھی کہ اُن کے ہاتھوں رونمائی کرواؤں گی) پھر اللہ پاک نے ہمت دی اور خود کو ڈپریشن سے نکالا اور 18 فروری 2026 (یکم رمضان) کو میری کتاب "بولوں کہ نہ بولوں" .پبلش ہو کر میرے ہاتھوں میں آئی تو میں بس خاموش کہ یکم رمضان کو شہزاد صاحب کی وفات ہوئی اور اُن کی برسی کے دن کتاب ہاتھ میں اور اللہ پاک نے 38 سالہ ادبی سفر کا انعام یہ دیا کہ "میں خیبر پختونخوا کی پہلی مزاح نگار خاتون بن گئی "جو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

4- ادارہ: بچوں کی پرورش جدید دور میں آسان ہو گئی ہے، یا پہلے سے مشکل ہے؟ اور بچوں کو کس حد تک آزادی دینی چاہئے؟
فائزہ شہزاد: میرے خیال میں آج کے جدید دور میں جدیدیت کی بدولت بچوں کی پرورش بہت مشکل ہو گئی ہے۔ پہلے سیدھا سادہ دور تھا، کوئی نخرے تماشے نہیں تھے، جس کی وجہ سے کم آمدن میں بھی سب کچھ بہت اچھے سے ہو جاتا تھا، یہ نہیں تھا کہ اُس دور میں بچوں کے کوئی تقاضے یا ضروریات نہیں تھیں، مگر میانہ روی تھی - دوسرا آج کل کے حالات میں اور ہمارے دور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بچوں کو ایک حد تک آزادی دینی چاہئے اور وہ آزادی بھی ایسے کہ زبردستی اُن پر اپنی مرضی (تعلیم کے سلسلے میں) نہیں تھوپنی چاہئے، اُن کا شوق، اُن کا رجحان دیکھیں کہ وہ کس شعبہ زندگی کو اختیار کرنا چاہتا ہے، سو اُسی میں اُس کا ساتھ دیں، باقی آج کل کے بچے جیسی آزادی چاہتے ہیں، اُس کی تو ہمارے دین میں بھی اجازت نہیں، کیونکہ وہ آزادی نہیں، تباہی ہے اور والدین نے آج کل خود کو اتنا مصروف کرلیا ہے کہ اُن کے پاس وقت ہی نہیں بچوں کے لئے۔۔ ماؤں نے اپنی آسانی کی خاطر بچوں کے ہاتھوں میں موبائل دے کر جان چھڑا لی ہے اور ایک ہم مائیں تھیں جو گود میں بچوں کو اُٹھا کر گھر کی صفائی ستھرائی کیا کرتی تھیں -

5- ادارہ: کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آج کی نوخیز نسل واقعی سُست ہے، یا پھر یہ زمانے کی تیزرفتاری کے ساتھ زیادہ باشعور اور بدلتی سوچ کی حامل ہے؟
فائزہ شہزاد: آج کی نوخیز نسل "تن آسان" ہوگئی ہے، ہرکام میں آسانی چاہتی ہے، چاہے وہ لڑکے ہو یا لڑکیاں، سب شارٹ کٹ کے چکروں میں ہیں (پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں، مگر زیادہ تر ایسے ہیں) اور اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری نوجوان نسل زیادہ باشعور اوربدلتی سوچ کی حامل ہے، اگر وہ چاہے تو اقبال کا شاہین بن کر ستاروں پر کمند ڈال سکتی ہے، مگر آج کی جدید ٹیکنالوجی اور خاص کر میڈیا نے ہماری نوجوان نسل کو اُس کے مدار سے باہر نکال دیا ہے اور ٹک ٹاک کا شاہین بننے میں زیادہ فخر محسوس کررہا ہے۔ (نوجوانوں سے معذرت کے ساتھ) اور ایک تو یہ جو "جینزی اور مینزی جنریشن آ گئی ہے اُس نے الگ پاگل کر دیا ہے اب لگتا ہے اِس کے بعد "چمپینزی" آنے والی ہے۔
6- ادارہ: یونیورسٹی جانے والے بچوں کے ساتھ اُن کے والدین کو روک ٹوک کرنی چاہئے اور کیسے؟

فائزہ شہزاد: جی بالکل کرنی چاہئے، بلکہ میرے خیال میں اسکول سے لے کر کالج تک کے بچوں کو روک ٹوک کرنی چاہئے مگر پیار سے، ڈنڈے اور سختی سے نہیں، کیونکہ اِن دونوں چیزوں سے وقتی طور پر ڈر پیدا ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ بچہ ڈھیٹ ہو جاتا ہے کہ چلو! دو منٹ کی ڈانٹ ہے، مار ہے، سہہ لو اور کرتا وہ اپنی من مانی ہے، بچپن سے ہی اُس کے دل، دماغ میں دین اسلام سے محبت پیدا کریں، اُسے گناہ ثواب، حلال حرام کا بتائیں، دوزخ سے ڈرا کر نہیں بلکہ اللہ اور رسُول صل اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اُن کے دلوں میں اُجاگر کریں کہ اُن کی محبت میں، عشق میں وہ غلط روش اختیار نہ کریں۔ پیار محبت سے بچوں کو سمجھانا ضروری ہے۔

7- ادارہ: چونکہ آپ ایک شادی شدہ خاتون ہیں اور ماشاء اللہ سے آپ کے بچے بہت قابل ہیں اور شادی شدہ بھی، تو شادی شدہ لائف کو بہترین بنانے کے لئے میاں، بیوی کو کیسے رہنا چاہیے؟

فائزہ شہزاد: بہت خوبصورت اور اہم سوال ہے آپ کا۔ شادی شدہ زندگی کوئی ڈرامائی یا فلمی زندگی نہیں، جس میں بس شادی ہوئی اور ڈرامہ یا فلم ختم اور سب کچھ ہیپی، ہیپی، میرے حساب سے تو اصل زندگی شروع ہی وہاں سے ہوتی ہے، جب زندگی میں اِک نیا موڑ آتا ہے، زندگی کوئی پھولوں کی سیج نہیں، جہاں صرف پُھول ہی پُھول آپ کا مقدر ہوں گے بلکہ ہمیشہ ذہن میں رکھیں کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں اور پُھول توڑنے سے پہلے کانٹے کا درد سہنا پڑتا ہے۔ میاں بیوی کا رِشتہ بہت خوبصورت اور پاکیزہ رِشتہ ہے جسے کامیاب بنانے کے لئے سب سے پہلے اپنی "میں" کو مارنا پڑتا ہے، اِس "میں" کے ساتھ کبھی رِشتہ مضبوط نہیں ہوتا، وہ صرف ایک سمجھوتہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کا دل سے احترام کریں، چھوٹی چھوٹی باتوں کو issue نہ بنائیں، دوست بن کر رہیں، "تھانیدار یا تھانیدارنی بن کر مت رہیں، بیوی بن کر رہیں، (ہاں جہاں آپ پر ظلم ہو، تشدد وغیرہ تو وہاں آپ کا حق ہے کہ اپنے لئے آواز اٹھائیں) محبوبہ صرف افسانوں میں ہوتی ہے جِس کے لئے ہیرو چاند، تارے بھی توڑ کر لانے کو تیار ہوتا ہے (جو کہ دُنیا کا سب سے بڑا جھوٹ بلکہ فراڈ ہے) پیار، محبت اور اخلاص سے اپنے اِس رشتے کو اور اِس رشتے سے جُڑے دیگر رشتوں (والدین، بہن بھائی وغیرہ) کو بھی نبھائیں اور اپنے گھر کو جنت بنائیں - چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے گھر خراب مت کریں، گھر بنانے میں سالوں گزر جاتے ہیں مگر ٹوٹنے میں صرف چند منٹ ہی لگتے ہیں - نئے گھر میں آ کر پیار، محبت سے جگہ بنانی پڑتی ہے، مگر افسوس کہ آج کی نوجوان نسل ہماری اِن باتوں کو مانتی ہی نہیں۔

8- ادارہ: زندگی کا کوئی ایسا تجربہ یا سبق جو ہمارے قارئین سے شیئر کرنا چاہیں۔

فائزہ شہزاد: زندگی نے ہر ہر موڑ پر ایسا تجربہ اور سبق سکھایا ہے کہ کیا بتاؤں اور کیا نہ؟ زندگی میں ایسے ایسے تجربے ہوئے ہیں کہ پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہُوں، سوچتی ہُوں کہ یہ سب واقعی حقیقت میں ہوا یا پھر میرا وہم ہے یا پھر کوئی کہانی،

کب ملی تھی، کہاں بچھڑی تھی ہمیں یاد نہیں
زندگی تجھ کو تو بس خواب میں پایا ہم نے

9- آپ کا پسندیدہ کھانا/ رنگ/ شوق/ ملک/ شخصیت/ مشاغل؟

فائزہ شہزاد: تمام کھانے پسند ہیں - شادی سے پہلے " کریلے اور شلجم "پسند نہیں تھے مگر شادی کے بعد سب کچھ کھایا، جو میاں جی کی پسند وہی میری بھی ہو گئی/ ڈارک گرے، رائل بلیو، براؤن اور گنبد خضریٰ والا سبز رنگ/ بہت سے شوق تھے جو وقت کی دُھول میں مٹ گئے اور میاں جی کے دُنیا سے جانے کے بعد سب شوق ختم ہو گئے، بس اب تو اِک خواہش ہے کہ آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در پر حاضری نصیب ہو جائے، اور وہیں گنبد خضریٰ کے سائے میں نعت خوانی کرتے دم نِکل جائے/ اپنا پاکستان، سوئزر لینڈ (ایسے کہہ رہی ہوں جیسے پیدائش سوئزر لینڈ کی ہو کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا) اور شہر پیارا مدینہ منورہ/ شخصیت میں تو آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر کوئی ہے ہی نہیں۔/ مشاغل میں لکھنا پڑھنا، کوکنگ(بہت اچھی باورچن بھی ہُوں یہ میں نہیں دُشمن بھی کہتے ہیں) باغبانی، خود اپنے ہاتھوں سے اپنے باغ کو سجایا بنایا، جون، جولائی کی تپتی دوپہروں میں بھی بیٹھی پودے لگا رہی ہوتی تھی(اب تو گٹے، گوڈے ہی جواب دے گئے تو بس۔۔۔)

10. ادارہ: پسندیدہ شعر/ کتاب ؟

فائزہ شہزاد: بہت سارے اشعار ہیں جو موڈ کے ساتھ ساتھ پسند آتے ہیں، یعنی جیسا اندر کا موسم ویسا ہی باہر کا

اب ہنسی بھی آتی ہے کہ کیا بچگانہ حرکتیں تھیں۔ ذرا دل اُداس ہو گیا تو دُکھی سے دُکھی شعر ڈائری میں لکھتے جانا، جیسے ہی دل خوش ہوا؛ توآتی ہے پَون جاتی ہے پَون؛ والا حساب اور موسیقی میں بھی یہی حالات ہیں۔ کتاب میں کوئی اسپیشل نہیں ہر کتاب پسند ہے اور زیادہ ترمیں وہ کتاب ہمیشہ اٹھاتی ہوں جِس کا نام بہت منفرد سا ہو۔ آج کل یہ پسند آیا تو لکھ لیا:

منزل سے آگے بڑھ کر منزل تلاش کر
مل جائے تجھ کو دریا تو سمندر تلاش کر
ہر شیشہ ٹوٹ جاتا ہے پتھر کی چوٹ سے
پتھر ہی ٹوٹ جائے وہ شیشہ تلاش کر

11. ادارہ: آپ اپووا میگزین کا حصہ ہیں اور ہر ماہ مزاح سے بھرپُور کہانی پڑھنے کو ملتی ہے، تو اِس صنف میں لکھنے کا شوق کیسے پیدا ہوا، اور اپووا میگزین میں لکھنے کا تجربہ کیسا رہا؟

فائزہ شہزاد: من آنم کہ من دانم

ابھی بھی خود کو طفل مکتب سمجھتی ہُوں، آتا جاتا کچھ نہیں، بس اتفاقاً لکھنے کی طرف آ گئی اور یہ اللہ پاک کی ایک بہت بڑی نعمت ہے میرے لئے کہ جس میں گم ہو کر میں اپنے ہر غم، پریشانی کو بُھول جاتی ہُوں اور طنز و مزاح کے ٹریک پر بھی بس اچانک سے آ گئی، اردو ادب تک نہیں پڑھا تھا کُجا کہ مزاح نگاروں کو پڑھتی ہاں تعلیمی دور میں "پطرس بخاری مرحوم" کے دو مضامین " کتے ، اور پطرس کی سائیکل" پڑھے تھے اور بس؛

میں ایک ماہنامے میں سچی کہانیاں لکھتی تھی تو ایک بار جو قارئین کی محفل تھی اُس میں ایک

سے ایک دُکھی خط اور خبریں تھیں تو بس ایسے ہی ذہن میں آیا کہ کچھ الگ سے کیا جائے کہ سب روتے ہوئے بھی ہنس پڑیں یعنی وہ پیدائشی مسکراتی فائزہ میدان میں آ گئی اور "نانی کے نام" سے مزاحیہ خطوط لکھنے شروع کئے جن کی بدولت بہت نام، بھی پیار ملا کہ بڑے چھوٹے سب ہی نانی کہنا شروع ہو گئے جب کہ اُس وقت بچے بھی کافی چھوٹے تھے۔ پھر درمیان میں کافی گیپ آیا مگر کرونا کے دوران پھر اِس طرف دوبارہ توجہ دی ۔ لکھا تو ہر صنف پر ہے یہاں تک کہ "پُر اسرار کہانیاں" بھی لکھی ہیں۔
اور اپووا میگزین میں لکھنا میرے لئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے اورسب سے بڑی بات کہ میری اتنی حوصلہ افزائی کی کہ مجھے "میگزین کے طنز و مزاح کے صفحے کا انچارج" بنا دیا اور مزے کی بات مجھے معلوم ہی نہیں تھا جب اپنا نام دیکھا تو پہلے حیران اور پھر پریشان کہ واقعی میرا ہی نام ہے یا "نظروں کا فتور" ہے اور اگست کے مہینے میں علی نے (جو ہر کام کمال کرتے ہیں یعنی من چلے کا سودا) اپوا ڈائجسٹ کا اجرا کیا تو معلوم ہوا کہ مجھے "مدیرہ" بنایا ہے میں نے میسیج کیا کہ یہ واقعی میں ہُوں؟ اسی پر بس نہیں چلاَ تو "اپووا ننھے پھول ڈائجسٹ" کی مدیرِ اعلیٰ بنا دیا۔ میں نے فون کیا کہ "کیا میں یہ کرسکتی ہوں؟" مگر یہ علی، یعقوب بھائی، ڈاکٹر فضیلت بانو اور سب کی محبت ہے جو اتنی عزت اتنا مان دیتے ہیں کہ میں یہی سوچتی ہوں کہ کیا میں اِس قابل تھی؟ پوری اپووا تنظیم کی میں دل سے شکر گزار ہوں۔
14 اگست کو لاہور میں شان پاکستان ایوارڈز کی تقریب سے میں اتنا پیار، اتنی عزت اور احترام کی دولت سمیٹ کر لائی ہُوں جو میرا نہائیت قیمتی سرمایہ ہے۔ میری کتاب کی رونمائی اور میری سالگرہ؛ میرے پاس الفاظ ہی نہیں۔

12. ادارہ: آپ اِس عہد کی لڑکیوں کو کیا نصیحت کرنا چاہیں گی؟
فائزہ شہزاد: اِنسان ساری زندگی سیکھتا ہے اور میں نے جو اپنی زندگی میں سیکھا کہ ایک لڑکی کو بہت سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا چاہئے کیونکہ اس نے آگے چل کر ایک نسل کی پرورش کرنا ہوتی ہے، جو جوش سے نہیں ہوش سے ہوتی ہے۔ ہر کوئی پاپا کی رانی ہی ہوتی ہے، ہم سب بھی تھے، مگر زندگی رانیوں کی اور شہزادیوں کی بھی آسان نہیں ہوتی، ہر تصویر کے دونوں رُخ ذہن میں رکھنے چاہئے، خود کو مضبوط بنائیں، والدین آپ کے سب سے بہترین دوست ہیں، اُن کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کریں ۔ اپنا ہر دُکھ سُکھ والدین سے بیان کریں، علامہ اقبال کی "مکھی اور مکڑے" والی نظم کو بس پلو سے باندھ کر رکھیں (لڑکیاں بے چاری کہیں گی کہ نصیحت کہی تھی یہ نانی اماں تو پورا پنڈورا کھول کر بیٹھ گئی)
خوابوں کی دنیا سے باہر نِکل کر زندگی کو حقیقت کی نظر سے دیکھیں، آج کل کے حالات بہت عجیب و غریب ہوچکے ہیں اور میری نظر میں اس کی وجہ ہماری دین اسلام سے دوری ہے، قرآن پاک کو ہم نے رٹو طوطے کی طرح پڑھنا سیکھ لیا مگر اُسے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

13. ادارہ: ادبی تنظیموں کے بارے میں کیا خیالات ہیں/ آپ کی نظر میں ادبی تنظیموں کے معاشرتی فوائد کیا ہیں؟

فائزہ شہزاد: میری نظر میں تو ادبی تنظیموں کی بہت اہمیت ہے اور یہ کسی بھی ملک کی ترقی و ترویج میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ نئے لکھنے والوں کو ایک بہتر پلیٹ فارم مہیا کرتی ہیں جِس پر چل کر وہ بہت کچھ سیکھتا ہے مگر یہاں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ "تنظیم" خود کیسی ہے؟ اسی، نوے کی دہائی تک معدودے چند تنظیمیں تھیں جو بہت فعال تھیں، کم مگر بہت بہتر اور ایمانداری سے کام کرتی تھیں - پھر ایک دم سے جیسے کوئی تنظیموں کا سیلابی ریلا ہی آ گیا اور زیادہ تر وہ تنظیمیں ہیں جو صرف اور صرف اپنے مفاد کے لئے اور نام کے لئے کام کر رہی ہیں۔

14. ادارہ: اپووا کو کیسا پایا/ پہلی مرتبہ اپووا سے تعارف کیسے ہوا/ اپووا نے آپ کو کیا دیا؟

فائزہ شہزاد: اپووا ایک بہترین تنظیم ہے، جو نوآموز لکھاریوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم ہے۔ میرا اور اپووا کا ساتھ چار/ پانچ سال سے ہے مگر محسوس یوں ہوتا ہے جیسے جنم جنم کا ساتھ ہو۔ اپووا کی انتھالوجی بک میں کہانی لکھ دی مگر وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی پزیرائی ملے گی، اور اپووا نے مجھے نام، پہچان، مان سمان دیا، مجھے ایوارڈز اور اسناد سے نوازا، اور پہلی ہی ملاقات میں پورے ادارے نے اتنی عزت، اتنا احترام اور محبت دی، احساس ہی نہیں ہوا کہ پہلی ملاقات ہے۔ بس پھر اِس کے بعد میں اور اپووا لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔ اِس کے بانی جناب ایم ایم علی صاحب اِس تنظیم کی فلاح و بہبود کے لئے دن رات کوشش اور محنت کر رہے ہیں اور ماشاء اللہ سے پوری ٹیم ہی ایک بہترین اور مثالی ٹیم ہے۔

جو اپنے تمام ممبرز کو ساتھ لے کر چلتی ہے، چاہے وہ کوئی ادبی تقریب ہو، گورنر ہاؤس جانا ہو کہ ناشتہ کرنا ہو، 2023 میں گورنر پنجاب جناب بلیغ الرحمان صاحب سے میٹنگ تھی تو مجھے خاص دعوت دی اور میں ساری بیماریاں بُھول بھال کر بھاگم بھاگ لاہور ایسے پہنچی کہ میاں جی اور بچے پریشان! کہ کہاں بیڈ پر بے سدھ پڑی تھی اور اب دیکھو ذرا۔ بہت ہی زبردست اور یادگار میٹنگ تھی وہ:؛ پھر

مجھے اتنا بڑا عہدہ دے دیا کہ مُجھ پر اعتماد کرتے ہوئے "اپووا کے پی چیپٹر" کا مجھے صدر بنا دیا۔ دو تین سال سے علی کی اور پوری تنظیم کی خواہش تھی کہ "آپی ہم پشاور میں kp چیپٹر بنانا چاہتے ہیں اور آپ کو صدر کا عہدہ دینا چاہتے ہیں، باقی آپ اپنی ٹیم بنا لیں، مگر میں گھبراتی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ میں کل کو ذمہ داری نبھا نہ سکوں تو مجھے شرمندگی ہوگی مگر علی نے کافی ہمت بندھائی اور حوصلہ دیا۔ میں نے اپنی پیاری دوست ناز پروین (جنرل سیکرٹری) سے اس سلسلے میں مشورہ کیا اور پھر ہم اس میدان میں کود پڑے۔ 20 جون 2025 میں جناب ایم ایم علی، سرپرست اعلیٰ ملک یعقوب اعوان صاحب کی قیادت میں ایک وفد نے پشاور آ کر اپووا کے ضلعی دفتر کا میرے گھر افتتاح کیا) بلکہ میں اِن سب کی بڑائی کہوں گی کہ شہزاد

صاحب کی بیماری میں خاص طور پر لاہور سے آئے اور اُن کی عیادت کی۔ اُن کی وفات پر جس طرح میرے غم میں شریک ہوئے اور ایک ایک فرد نے میری ڈھارس بندھائی۔ 6 نومبر کی ایک یادگار تقریب میں مجھے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت سرائی کا موقع دیا اور مکتوب نگاری میں چھٹی پوزیشن پر انعامات سے بھی نوازا جو میرے لئے دُنیا کا سب سے بڑا اعزاز اور میڈل ہے۔

15: ادارہ: کوئی پیغام جو آپ ہمارے قارئین کو دینا چاہتے ہیں؟
فائزہ شہزاد: باتوں باتوں میں اتنے پیغام دے گئی ہُوں ڈر ہے کہ قارئین تنگ نہ ہو جائیں، مگر چلتے چلتے ایک بات کہ اپنی زندگی میں جو بھی کام کریں، ایمانداری سے کریں، خلوصِ دل سے کریں، اپنے رشتوں کا احترام کریں اور آج کا کام کل پر کبھی مت چھوڑیں، والدین کی دعائیں لیں کہ اِن کی دعائیں آپ کی قسمت کے بند دروازوں کی کنجیاں ہیں۔ آج کل ارد گرد جب والدین کو غمزدہ دیکھتی ہوں تو دل خون کے آنسو روتا ہے کہ جن والدین نے اپنی جوانی، اپنی خواہشات کو مار کر اِن بچوں کو پالا پوسا۔ وہ آج کو کہتے ہیں کہ آپ کا فرض تھا کوئی احسان تھوڑی ہے، اولڈ ہاؤسز میں جانے کا اتفاق ہوا، بس نہیں بتا سکتی کہ دل کی کیفیت کیا تھی، بچہ جب تک گھر نہ آ جائے، ماں کو نیند نہیں آتی، مگر وہی بچہ ماں کو اولڈ ہوم میں چھوڑ کر کیسے سکون کی نیند سوتا ہے؟ بس میرے بچو! باادب ہی بانصیب ہوتا ہے۔ صبر، برداشت، عزت اور احترام سے اپنے گھر اور اپنے رشتوں کی قدر کریں۔
آپ سب کی بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ مجھے اتنی باتیں کرنے کا موقع فراہم کیا۔ خوش رہیں سلامت رہیں آمین یارب العالمین!

"ہم اور ہماری سکن"
(نیلوفر سمیع؛ کاسمیٹولوجسٹ)

خوبصورت نظر آنا ہر عورت کی خواہش ہوتی ہے۔ ہم سب چاہتی ہیں کہ ہمارا چہرہ صاف، تازہ اور خوبصورت نظر آئے۔ لیکن میرے نزدیک خوبصورتی صرف خوبصورت چہرے یا اچھے میک اَپ کا نام نہیں۔ اصل خوبصورتی اپنی ذات کا خیال رکھنے، صفائی کا اہتمام کرنے اور خود کو اہمیت دینے سے شروع ہوتی ہے۔

اکثر خواتین گھر، بچوں اور خاندان کی ذمہ داریوں میں اتنی مصروف ہوجاتی ہیں کہ اپنے لیے وقت نکالنا بھول جاتی ہیں۔

وہ سب کا خیال رکھتی ہیں، لیکن اپنی جلد، بالوں اور صحت کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔

ہمیں یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اپنے آپ کا خیال رکھنا خود غرضی نہیں، بلکہ ہماری ضرورت ہے۔

خوبصورتی کے لیے ہمیشہ مہنگی کریمیں، قیمتی میک اَپ یا بیوٹی پارلر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ سب سے پہلے ہمیں اپنی جلد اور بالوں کی ضرورت کو سمجھنا چاہیے۔ ہر عورت کی جلد ایک جیسی نہیں ہوتی، اس لیے جو چیز کسی دوسری خاتون کو فائدہ دے رہی ہے ضروری نہیں کہ وہ ہمیں بھی فائدہ دے۔

کسی بھی بیوٹی پراڈکٹ کو استعمال کرنے سے پہلے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ضروری ہے۔ خاص طور پر ایسی چیزیں جو فوراً رنگ صاف کرنے، داغ دھبے ختم کرنے یا چند دنوں میں چہرہ بدل دینے کا دعویٰ کرتی ہیں، ان کے استعمال میں احتیاط کرنی چاہیے۔ جلد ہماری قدرتی خوبصورتی ہے، اسے جلدی نتائج کے لیے نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔

میری ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ خواتین کو صرف میک اَپ سکھانے کے بجائے انہیں اپنی جلد، بالوں اور ذاتی صفائی کے بارے میں بنیادی معلومات بھی دی جائیں۔ اسی مقصد کے تحت میں نے کاسمیٹولوجی کے موضوع پر اپنی کتاب "پری چہرہ" بھی لکھی، تاکہ خواتین اور بیوٹیشنز خوبصورتی کو صرف ظاہری شکل کے بجائے علم اور احتیاط کے ساتھ سمجھ سکیں۔

ہر ماہ کے اس سلسلے میں میری کوشش ہوگی کہ میں خوبصورتی کے بارے میں اپنی عملی معلومات اور تجربات آپ کے ساتھ آسان الفاظ میں شیئر کروں۔ ہم جلد، بال، میک اَپ، ہیئر ٹریٹمنٹ، صفائی، بیوٹی پراڈکٹس اور بہت سے دوسرے موضوعات پر بات کریں گے۔

میری تمام خواتین سے ایک چھوٹی سی درخواست ہے: دوسروں کا خیال رکھنے کے ساتھ اپنے آپ کو بھی وقت دیں۔ آئینے میں صرف اپنی خامیاں تلاش نہ کریں، اپنی خوبصورتی کو پہچانیں۔

خوبصورت نظر آنا اچھی بات ہے، لیکن اپنی صحت اور قدرتی خوبصورتی کی حفاظت اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔

"غزل"

(شہزاد نیر)

ایسا نہیں کہ یوں ہی وفا کر رہا ہوں میں
میرے ضمیر نے جو کہا، کر رہا ہوں میں

تسلیم کے دیار میں اِنکار بانٹ کر
جو فرض تھا وہ قرض ادا کر رہا ہوں میں

اب میرا اِختلاف نِصابوں میں آ گیا
کچھ لوگ کہہ رہے تھے خطا کر رہا ہوں میں

آخر مجھے سکون ملا اپنی ذات میں
ویسے کسی کے دل میں بھی جا کر رہا ہوں میں

ہم دونوں ماحَصَل میں برابر شریک ہیں
تم کام کر رہے ہو، دعا کر رہا ہوں میں

میری شکایتوں پہ نہ بیگانہ وار دیکھ
اپنا سمجھ کے تجھ سے گلِہ کر رہا ہوں میں

جب لوگ پوچھتے ہیں یہ کیا کر رہے ہو تم
میں خود سے پوچھتا ہوں، یہ کیا کر رہا ہوں میں

تعمیر کر کے روز اُداسی کا اِک مکاں
تنہائیوں کا شہر بڑا کر رہا ہوں میں

میں چاہتا ہوں مجھ میں فقط خالی پن رہے
ارض و سما کو دل سے جدا کر رہا ہوں میں

نو سال ایک چاک گھماتا رہا مجھے
نو سال ایک حُسن کا چاکر رہا ہوں میں

چوٹی سے چوٹ کھا کے میں گھاٹی میں آ گرا
آدم کے واقعے کو نیا کر رہا ہوں میں

کر کے رہا ہوں چاک تری پردہ داریاں
لوگوں کو ساری بات بتا کر رہا ہوں میں

تجھ کو یہ لگ رہا ہے مجھے قید کر دیا
خلقت کے دل میں جا کے پتہ کر، رِہا ہوں میں

اُن کی برائیوں کا اُنہیں بھی پتہ چلے
نیّر بُروں کے ساتھ بھلا کر رہا ہوں میں

"غزل"
(شہزین فراز)

تُو جب سے اوروں کی ناؤ پر ہے
ہماری دنیا بھی داؤ پر ہے

ہمیں جِلا دے یا پھر جَلا دے
محبتوں کے الاؤ پر ہے

میں ڈوب جانے کی آس میں ہوں
جنون اپنے بہاؤ پر ہے

یہ سرگزشتِ محبتّاں اب
زمانے بھر کے سجھاؤ پر ہے

ابھی تو احباب مل کے گزرے
نمک سا کچھ میرے گھاؤ پر ہے

الجھنے کا ہم سے سوچنا مت
ابھی لہو بھی دباؤ پر ہے

میں ارتفاعِ وجود پر ہوں
کہ میری وحشت کٹاؤ پر ہے

سو اب تو بےلوث بھی نہیں کچھ
مدار سب رکھ رکھاؤ پر ہے

"غزل"
(فیضان احمد فیضی)

وحشتِ عشق میں تھک ہار کے رنجور گرے
درد سے جیسے کوئی ہو کے بہت چُور گرے

اس نے اک خاص تناسب سے مجھے زہر دیا
تاکہ یہ شخص علاقے سے کہیں دُور گرے

پیڑ سے کون گلے لگ کے یہاں رویا ہے
کس کے لہجے کی اُداسی سے یہاں بُور گرے

کون سمجھے گا مرے گاؤں کا یہ غم کہ جہاں
اک سڑک پُختہ بنی، سینکڑوں تندور گرے

آپ نے مجھ سے محبت کی توقع کی ہے؟
آپ بتلائیں کبھی نِیم سے "انگور" گرے؟؟

زخم کی کاشت کبھی آب سے محروم نہ ہو
کاش اس آنکھ سے اک گریہ ء ناسور گرے

فیضی میں کس کو بتاؤں کہ مرے صبر کے پھل
وقت نے شاخ ہلائی تو بہت دُور گرے

"نثری نظم"
(ملک یعقوب اعوان)

ہم ادھوری ملاقات کی سرشاری کو لیے
جب اپنے گھروں کو لوٹے تو میکدوں کے چراغ
تک بجھ چکے تھے

دل کا مبد تیری حدت کی وحدت پر
سجدہ ریزی میں ایسا مشغول ہوا

کہ کچھ خبر نہیں، کب رات بیتی
کب سفیدی نے تاریکی کی جگہ لے لی

تم رات میں جیسمین کی مہک لیے، میرے دل
کے غنچے میں جو اترے تھے
اب گلاب کی طرح دن کو مہکا رہے ہو

نثری نظم
"خود سے ہم نشینی"
(ملائکہ حورین)

تنہائی!
میرے لیے کبھی سناٹے کا نام نہیں رہی
یہ وہ گوشہ ہے جہاں میں
دنیا کے ہنگاموں سے بچ کر
اپنے دل کی سرگوشیاں سنتی ہوں

یہ وہ لمحے ہیں جب میں
کسی چائے کی بھاپ کے ساتھ
خود کو خود سے ملا لیتی ہوں۔

نہ کوئی سوال، نہ کوئی جواب
بس خاموشی میں بھی ایک گفتگو جاری رہتی ہے

میں خود سے محوِ کلام ہوتی ہوں،
اپنے اندر کی الجھنوں کو سہلاتی ہوں
اور خود کو سمجھنے کی
وہ کوشش کرتی ہوں
جو کوئی دوسرا کبھی نہیں کر سکتا

یہ تنہائی میرے لیے تنہا ہونا نہیں
بلکہ خود سے ہم نشین ہونا ہے
یہ وہ وقت ہے
جب میں سب سے زیادہ خود کے قریب ہوتی
ہوں

All Pakistan Writers Welfare Association

آل پاکستان رائٹرز ویلفیئر ایسوسی ایشن

APWWA